

67/ROP

چراغِ تہذیب و آمان

اقبال متین

قیمت: ————— 25

کتابت: شهید صفی پوری

اشاعت: دسمبر ۱۹۷۶ء

طباعت: نامی پریس لکھنؤ

تعداد: ۶ سو

چراغِ تہذیبِ دُامان

ناول

اقبالِ مَتین

نصرت پبلشرز، کپورہ مارکیٹ، دکنویہ سٹریٹ، لکھنؤ ۳

انساب

بہت پیارے اور محترم بھائی
ڈاکٹر سید عبدالمنان کے نام

کہ

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
 یاں ہے جلاؤ و میسج بخدا ایک ہی شخص
 (حالی)

— اقبال متین —

وہ بحرہ جو جھیل کے شفاف سینے پر ڈول رہا ہے کوشلیا ابھی ابھی اس سے اتری ہے اس نے ننھے شانوجہ کا ہاتھ تھام لیا ہے جو ابھی تک بحرے ہی میں کھڑا اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسکرا رہا تھا۔

کوشلیا کے چہرے پر پانی کے قطرے دمک رہے ہیں اور اس کی لمبی لمبی سی زلفوں میں بھی پانی کی بوندیں اس طرح اٹکی ہیں جیسے موتی پر ویسے گئے ہوں۔ یقیناً پانی کے یہ موتی بحرے کے ان نئے مسافروں نے کوشلیا پر پھینکے ہیں۔ — ننھا شانوجہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ان مردوں کے مذاق پر ہنستا رہا ہو گا جو کوشلیا سے کچھ ہی پہلے بحرے سے اترے ہیں۔

آج ننھے شانوجہ نے اتنی ضد کی ہو گی کہ کوشلیا کی وہ مانتا جاگ پڑی جسے تھپک تھپک کر وہ سلاتی رہی ہے۔

برودے گیسٹ ہاؤس اتنی بلندی پر ہے کہ موٹے آدمی اس تک پہنچتے

پہنچتے اپنے لگتے ہیں۔ یہ گیسٹ ہاؤس اپنے پُر فضا مناظر، صحت بخش آب و ہوا، اطراف میں بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑوں اور ایک گہری خوفناک کھائی کے لئے مشہور ہے۔

برہن بستی کا قریہ اس گیسٹ ہاؤس سے صرف دو اڑھائی میل ہے۔ ضروریات زندگی کی ساری دکانیں برہن بستی ہی میں تھیں۔ بروڈے گیسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے احاطے سے دو فرلانگ پرفیورک ہینسن کا خوبصورت ساریٹورنٹ ہے جس کا نام فیوزے ہے۔ فیوزے میں آپ کو ہندوستانی شراہیں، دبتے اور سور کا گوشت اور گائے کی زبان، اتوار، پیر اور کبھی کبھی منگل کو بھی مل سکتے ہیں۔ آج چھ سال سے کوئی اتوار بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب کہ یہ ساری چیزیں دور اور نزدیک سے آنے والے مسافروں اور ٹورسٹوں کو نہ ملی ہوں۔ پیر اور منگل کے سلسلے میں ہینسن کبھی دعویٰ نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اتوار کے دن نہیں کا لفظ وہ اپنی ڈکشنری سے خارج کر دیتا ہے۔

جوں جوں بروڈے گیسٹ ہاؤس کی چہل پہل میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے کوئلیا کے بدن پر نئے نئے کپڑے دکھائی دینے لگے ہیں اور سٹل ہے کہ ہینسن بھی ایک چھوٹی سی سکندھینڈوین VAN خریدنے کے منصوبے بنا رہا ہے کہ وہ روز نہیں تو ہر دوسرے تیسرے دن شہر سے تازہ گوشت،

مچھلی اور کچے بھینگے اپنے فیوزے کے لئے لاسکے۔

کوشلیا اور فیوزے ان دونوں کو برو دے گیسٹ ہاؤس سے الگ کر لیا جائے تو ہم اس کے مناظر کی دیکشتی اور خوبصورتی ہی کو سرے سے کھو بیٹھیں۔ کوشلیا تو برو دے گیسٹ ہاؤس کو آغوش میں لئے ہوئے ہر منظر کا ایک حصہ ہو کر رہ گئی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کوشلیا کا تصور ننھے شانو جہ کو ہٹا کر ممکن نہیں۔

شانو جہ پانچ چھ سال کا بڑا پیارا سا بچہ ہے۔ کوشلیا نے اپنی کوکھ سے اسے جنم دیا ہے اپنی چھاتیاں چٹا کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ اور آج یہی کوشلیا کبھی اس کے گال پر طمانچہ لگا کر اس سے کہتی ہے۔ تو مر نہیں جاتا۔

ہینسن نے بھی کبھی کبھی سوچا ہے، واقعی شانو جہ مرجائے تو؟ پھر اس خیال پر تاسف کرتے ہوئے اس نے اپنی انگلی سے اپنے ہی سینے پر صلیب کا نشان بتایا ہے۔ یعنی اس نے شانو جہ کی موت کی خواہش اپنے دل سے نکال پھینکی ہے اور توبہ و استغفار کا اظہار اس صلیب سے کیا ہے جو ابھی ابھی اس نے اپنے سینے پر انگلی کے اشارے سے بنائی ہے۔

ہینسن کی یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ شانو جہ مرجائے۔ وہ کوشلیا کے دل میں اس مردہ ماما کو زندہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے جو اسکے خیال میں

کبھی کی مرگئی ہے۔ اس ماما کو زندہ دیکھنے کے لئے وہ چاہتا ہے کہ شانوجہ مر جائے بھی تو مضائقہ نہیں۔۔

ہینسن کہتا ہے کہ آنے والے مسافروں نے مل جل کر کوشلیا کی ماما لوٹ لی ہے۔ فیوزک ہینسن کو کبھی کبھی یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اسے اپنے فیوزے سے جتنا پیار ہے کوشلیا کو شانوجہ سے اتنا پیار بھی نہیں ہے۔ ہینسن اپنا تقابل کوشلیا سے غلط کرتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ فیوزے اگر اس کا بچہ ہے تو بڑا کمزور پوتہ ہے شانوجہ کی بات الگ ہے۔ شانوجہ تو اتنا ضدی ہے کہ کوشلیا کو اچھے خاصے سخی مسافر تک کے پہلو سے اٹھ کر اپنے اتارے ہوئے کپڑے پھر سے پہن لینے پڑے ہیں۔ اور مسافر نے بھٹا کر کوشلیا سے کہا ہے۔

”پھینک کیوں نہیں دیتیں اس روڑے کو کھائی میں“

کتنے ہی مسافروں نے کوشلیا کو مشورہ دیا ہے کہ وہ شانوجہ کو کھائی میں پھینک دے۔ وہ موقع محل دیکھ کر کبھی مسکرا کر رہ گئی ہے کبھی شانوجہ کے گال پر طمانچہ جڑ دیا ہے۔

یہ دونوں مسافر جنہوں نے تارا متی ایٹم بوٹ پر بحرے کو ترجیح دی تھی برودے گیٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۳ میں اترے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں ہے۔ یہ برودے گیٹ ہاؤس ہی میں ایک

دوسرے سے متعارف ہوئے ہیں۔ جب یہ بس سے اتر کر گیٹ ہاؤس پہنچے تو ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے لیکن برد دے ہاؤس کے سارے کمرے چونکہ ایگج تھے اس لئے ان دونوں نے کمرہ نمبر ۳ میں دو بستر لگوانے پر منیجر سے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔

ان دونوں نے آپس میں یہ تصفیہ کر لیا ہے کہ کوشلیا کے ساتھ رہنے سے متعلق قرعہ اندازی کر لی جائے۔ جس کا نام پہلے اٹھے گا کوشلیا پہلے اس کی ہوگی اور دوسرا آدمی اس وقت تک شانوجہ کو سنبھال لے گا، اگر وہ نیند سے جاگ جائے۔

لیکن کوشلیا نے انھیں بتا دیا ہے کہ جناب یہ مٹا دس بجے رات سے پہلے سوئے گا نہیں کیوں کہ یہ دوپہر کو بہت سو کر اٹھا ہے اور جب تک یہ جاگتا رہے گا میں کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔

جب کوشلیا نے فیصلہ کن انداز میں یہ بات کہہ دی تو ان دونوں نے رات یہیں گیٹ ہاؤس میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور فیوزے میں ڈنر کا آرڈر دینے کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک نے کوشلیا کو پلٹ کر دیکھا اور کوشلیا نے جواب میں مسکراہٹ پھینک دی اور بڑی ادا سے شانوجہ کو پھرے سے کھینچ کر گود میں بھر لیا۔

شانوجہ ادھر کوئی چھ سات ہینے سے کوشلیا کو بہت دق کر رہا ہے۔ درنہ

وہ پہلے اتنا ضدی نہ تھا۔ ایک حد تک وہ بحرے دالے کا کاسے مانوس ہو چلا تھا۔ بحرے والا بوڑھا کا کا۔ شانوجہ بھی کا پکارنے لگا۔ بحرے دالے کا کاسے بہت کوشش کی کہ شانوجہ اسے دادا پکارے لیکن شانوجہ راضی نہ ہوا۔ بحرے دالے کا پھوس کی ایک کشادہ کیٹیاں بھیل کے کنارے رہتا ہے۔ کوشلیا بھی کا کا کے ساتھ ہی رہتی ہے اور شانوجہ بھی اسی کیٹیاں کا باسی ہے۔ رات تھپک تھپک کر لوریاں دے دے مگر کوشلیا شانوجہ کو سلا دیتی تو پھر — اس کے سنور نے سجنے کا وقت شروع ہوتا — وہ دن بھر شانوجہ کو مشغول رکھتی اور سر شام ہی وہ سو جاتا — شانوجہ اس کا عادی ہو چکا تھا دن میں ایک منٹ کو بھی اس کی پلک نہ جھپکتی اور شام ہوتے ہوتے وہ دینا سے بے نیاز ہو جاتا پھوس کے بھونپڑے میں دے جلتے اور شانوجہ کی آنکھوں کے جگنو اپنی روشنیاں گل کر لیتے۔ ان دنوں کوشلیا کو آنے والے مسافروں اور ٹورسٹوں کو خوش کرنے میں اتنی دیر نہ لگتی — شانوجہ کو پچکار کر بہلا کر اس سے جدا ہونے میں اتنے جتن اسے نہ کرنے پڑتے تھے۔ کئی بار تو یوں بھی ہوتا کہ کوشلیا شام ہوتے ہوتے بن ٹھن کر مسافر کے ساتھ برودے یا فیوزے چلی جاتی اور شانوجہ کا کا سے کھیلتا کھیلتا سو جاتا، کبھی کوشلیا نہ ہوتی اور بھیل کی سیر کے لئے مسافروں کی ٹولی یا کوئی محبت کرنے والا جوڑا اس کیلٹا تو کا کا شانوجہ کو بھی اپنے ساتھ بحرے میں بٹھا لیتا اور وہ کا کا کی گود میں بیٹھا اپنے ننھے ہاتھ اس طرح ہلاتا جیسے کا کا

نہیں خود وہ چوپچلا رہا ہو۔

چٹکی ہوئی چاندنی راتوں میں بھیل کے شفاف پانی میں سپر ٹکائے ہوئے جب کوشلیا کیلی بیٹھی چاند کا عکس پانی کی لہروں میں ٹوٹتا ہوا دکھتی تو وہ بڑی گم سم سی رہتی۔ پیر ہلا کر بھیل میں ہلکے رے پیدا کرتے کرتے وہ ایک دم بُت کی طرح خاموش ہو جاتی۔ پانی آہستہ آہستہ ختم کر آئینہ بن جاتا اور وہ اپنا چہرہ چاند کے برابر بھیل کے دل میں اترتا ہوا دیکھ کر اداس ہو جاتی۔ پھر یکایک پیر ہلا کر اس سارے منظر کو بڑی بے دردی سے وہ تہس نہس کر دیتی۔

بڈھا کا کچھ جان کر پھوس کے بھونپڑے سے ٹکل آہنا اور کوشلیا کو آواز دیتا تو وہ پلو سے آنسو خشک کر کے اٹھ کھڑی ہوتی اور اگر ایسے میں کوئی مسافر بھی کاکا کے ساتھ ہوتا تو کوشلیا اسی طرح ہنستی ہوئی کاکا کی جانب بڑھتی کہ مسافر کو پہلی نظر ہی میں اس پر پیار آجاتا۔

فیوزے لیک میس (FUZAY LAKE MESS) کا مالک مینس کوشلیا کے اس روپے سے قطعی نا بلند ہے کہ چاندنی راتوں میں اس پر اداس اداس رہنے کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ چاندنی راتوں میں کوئی مسافر بحرے میں سوار ہو کر بھیل کی سیر کو نکلتا اور اس کے ساتھ کوئی لڑکی یا عورت محبوبہ یا بیوی نہ ہوتی تو کوشلیا اس مسافر کے لئے پہلے محمود بن جاتی پھر بیوی۔ بحرے سے اترے ہوئے دونوں مسافر فیوزے پہنچے تو مینس نے تھوڑا جھک کر

ان کا سواگت کیا۔ ان دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ شرابیں یہاں ملتی ہیں۔ جب فیوزے میں انہوں نے قدم رکھا تو آنکھیں چرکا چوند ہو گئیں۔ وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اپنے اپنے لٹچی میں جتنی کچھ انہوں نے سنبھال رکھی ہے، برو دے ہاؤس کے کمرہ نمبر ۳ میں پہنچ کر یا زیادہ سے زیادہ لان میں بیٹھ کر اسی سے لطف اٹھانا ہے۔ لیکن یہاں تو فیوزے کی سبج دھجج ہی اور تھقی۔ خوبصورت سی کرسیاں، چھوٹی چھوٹی میزیں۔۔۔ تار اور چکریوں سے ٹنگے ہوئے سرسرا تے پردے کہ جب چاہیں پھینک کر دنیا کی نظروں سے اس طرح چھپ جائیں جیسے اپنی روح کی نیم برہنگی سے چھپتے ہیں۔

ان میں سے ایک مسافر نے جو گنجا تھا اس مسافر کی طرت دیکھا جس کے سارے کے سارے بال تو تھے لیکن جو عمر سے پہلے شاید سفید ہو گئے تھے، حالانکہ ابھی اس کا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ کم سے کم کو شیلانے ایسا محسوس کیا کہ اس کا خون سفید نہیں ہوا ہے لیکن اس نے اپنے بال بھی لال کر رکھے تھے۔

دونوں مسافروں کو آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتا ہوا دیکھ کر فیوزے ہنسنے لے مزید خوش اخلاقی اور انکساری کا ثبوت دیا۔

”آپ شاید لیاک (بھیل) سے آرہے ہیں؟“ — اک ذرا گردن کو خم کر کے بڑی نرم مسکراہٹ سے ہنسنے لگا۔
 ”ہاں جی“ — گنجنے مسافر نے بتایا جو گنجا ہونے کے باوجود بڑا سبیل تھا۔

دوسرے نے پوچھا — ”آپ نے کیسے جان لیا۔“

ان پہلے گلابوں سے — ہنسن نے مسکراہٹ میں وقار پیدا کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور انہیں بتایا کہ پہلے گلاب سارے پارک اور گسٹ ہاؤس میں نہیں لگائے گئے ہیں — یہ رنگ جھیل کے لئے مختص کر دیا گیا ہے — کوئی مسافر جھیل سے لوٹتا ہے تو یہی پھول اس کے رومانس کی جغلی کھاتے ہیں۔

دونوں مسافر ذرا سا چونک کر مسکرائے۔

”وہ کیسے“ — ایک نے پوچھا

”وہ اس طرح کہ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ یہ پھول آپ کو کس نے دیے ہیں — اور اس پھول کے لیے آپ نے صرف ایک آنہ دیا ہو گا لیکن اور بہت کچھ دے دینے کا ارمان دل میں لیے آئے ہوں گے — آپ لوگ تو خیر اپنی محبوبہ یا بیوی کے ساتھ نہیں آئے ہیں — میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی دل نواز بیویوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو اپنے پہلے گلاب ان کی زلفوں میں سجا دیتے ہیں لیکن دوسری بار جب وہ آتے ہیں تو تنہا ہوتے ہیں تاکہ اس پہلے گلاب کو جی بھر کر سونگھ سکیں۔“

دونوں مسافروں نے اس طرح تہقہہ لگایا جیسے تہقہ کی نقل اتار رہے ہیں۔

”کیوں صاحب کو شیلانے ہی یہ پھول دیے ہیں نا — ہنسن نے ذرا سا قریب

ہو کر اس طرح کہا کہ سامنے کھڑا ہوا بیر اسب کچھ سن کر بھی جیسے کچھ نہ سن سکا۔
لال بالوں والے مسافر نے کہا — ”بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ ان کو تو کوئی
نے ہی پھول دیا ہے اور مجھے شانوجہ نے۔“

”شانوجہ کا زمانہ آرہا ہے جناب۔“

ہنسنے بائیں آنکھ بند کر کے گنچے مسافر کی طرف دیکھا اور پھر دونوں نے
فاتحانہ طور پر لال بالوں والے کی طرف اور سب ہی ہنسنے پڑے۔

خوش اخلاقی کے اس مظاہرے کے بعد سنسن نے مطلب کی بات کی۔
”فرمائیے“ گردن کو خم کر کے حسب عادت اس نے پوچھا — ”کیا خدمت
کروں — دہسکی، روم، برانڈی، بیر، جو آپ کہیں۔“
”اور اگر ہم پینے کے دوران میں کو شلیا سے باتیں کرنا چاہیں تو — کیا وہ
یہاں آسکتی ہے۔“

”بیشک بیشک — کیوں نہیں آسکتی — فیوزے پر آپ کا اتنا ہی حق
ہے جتنا کہ کو شلیا پر لیکن آج ٹورسٹ زیادہ آتے ہیں — مہینے کا پہلا اتوار ہونا
— اور کو شلیا ہی کی وہ شخصیت ہے جو اسٹیم بوٹ کی طرف جانے والے
مسافروں کو بھی بھرے کی طرف کھینچ لیتی ہے، بہر حال یہ اس کا اور آپ کا معاملہ
ہے — آپ بلا لائیں — فیوزے میں کو شلیا ہو یا کسی کی دھرم تپنی سب
یکساں ہیں۔“

ہینس پھر ایک بار اسی انداز سے جھکا۔ اس نے کہا — ”فیوزے میں ہر عورت کی تعظیم کی جاتی ہے جناب۔“

دونوں مسافروں نے ڈنر اور دس سال پرانی تھری اکس رم کا آرڈر دیا اور کوشلیا کے لئے جھیل کی جانب روانہ ہوئے تو ہینس نے تعظیماً جھک کر کہا۔
 ”کوشلیا تو صرف گولڈن ایگل بیرویتی ہے اور کبھی موڈ میں ہو تو آپ تھوڑی سی جن بھی اس میں ملا سکتے ہیں اور فیوزے میں آپ کو کسی چیز لی کمی نہیں ہے۔“
 کوئی آدمی گھٹنے بعد جب دونوں مسافر جھیل سے لوٹے تو کوشلیا اور شانوجہ دونوں ہی ان کے ساتھ تھے۔

لال بالوں والے مسافر نے مسکرا کر ہینس سے کہا۔
 ”بڑی مشکل سے آئی ہیں کوشلیا دیوی۔“

وہ تو میں جانتا تھا، ہینس نے کہا — *Stolen of the lake* =
 (جھیل کا باپ) سچا چلاتا ہے کوشلیا، *Fairy of the Lake* (جھیل کی پری) بڑھے کا کا کے لئے اپنی مسکراہٹ پھینک کر ٹورسٹوں کو گھیر لیتی ہے — میں تو حیران ہوں کہ وہ وقت سے پہلے کس طرح آسکیں — جھیل کے چار چھ چکر کے لیے تو ابھی کچھ اور لوگ فراہم ہو سکتے تھے، اتنا وقت تو ابھی ہے اور آج لوگ بھی زیادہ ہیں۔“

”ہم نے بحرے کی ٹرپس رکوا دی ہیں۔“

گننے مسافر نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

”یہ اچھا کیا آپ نے — دس روپے تو دیوبوی جی کے بھینٹ کرنے پڑے ہوں گے۔ لیکن بڑھا کا اس عمر میں مزید محنت کرنے سے تو بچ گیا۔ چلئے اب آپ فراغت سے بیٹھ سکتے ہیں۔“ گویا ہینسن نے مسافروں کے اس خرچ کو ضمیمہ قرار دیا اور دونوں مسافر ایک حد تک مطمئن سے نظر آئے۔

”تم جانتے ہو نا ہینسن کہ میں نے انھیں ٹھگ نہیں لیا ہے“ کوشلیا نے اپنے کئے کی مزید توضیح چاہی اور اپنی لمبی لمبی دونوں چوٹیوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نسخہ شانوجہ کے ہاتھ ان سے باندھنے لگی۔

”کاش کوئی مجھے اس طرح قید کرتا۔“ لال بالوں والے نے کہا لیکن ہینسن نے بولنا شروع کر دیا تھا اس لئے کوئی اور اس بات کو شاید نہ سن سکا سوائے کوشلیا کے جو مسکرا رہی تھی۔

”ہاں جناب — ہینسن نے فوراً سا بھک کر وکالت کی — بھرے کے ٹرپس رکوانے کے لیے کوشلیا دیوبوی سے محبت کرنے والا ہر مرد یہی کرتا ہے۔ آپ تو خوش قسمتی سے دو دو ہیں۔ share (شیر) — کر لیا ہو گا۔“

دونوں ہنسے کوشلیا بھی ہنسی، ہینسن بھی ہنسی میں شامل ہو گیا یہاں تک کہ بیرا بھی۔

لیکن شانوجہ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا — وہ کوشلیا کا ہاتھ جوڑ کر

اٹیل کی فولٹنگ کر سی سے الجھ گیا تھا۔ اس نے کر سی بند کرنی چاہی جو اس سے پوری طرح بند نہ ہوئی۔ پھر کھولنی چاہی تو اپنی انگلی پھنسا بیٹھا پیک کر کوشیا نے اس کی مصیبت دور کی لیکن وہ چل گیا۔ اور سب کو اپنے سے ہمدردی کرتا ہوا دیکھ کر بسکٹ اور پیسٹری کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

”دیتے ہیں بابا سب دیتے ہیں“ ہنسن، شانوجہ سے اس طرح مخاطب تھا جیسے دونوں مسافروں سے کچھ کہہ رہا ہو۔

گنجے مسافر نے بہل کی۔

”بے بی کے لئے بسکٹ پیسٹری اور چاکلیٹ“ اور سب کے سب میز کی طرف بڑھ گئے تو میرے نے چکریوں پر گھومنے والا پردہ کھینچ دیا جو سر اسر بھول گیا۔

”اور بے بی کی ماں کے لئے جناب“ ہنسن آگے بڑھ کر ذرا سا جھک گیا۔

”تم جانتے ہو ہنسن“ کوشیا نے یہ کہہ کر جیسے ہنسن کو جتلا دیا کہ اب وہ بھی آرڈر دینے کی اہل ہو گئی ہے جس کے لئے ان مسافروں کی منظوری ضروری نہیں۔

”جانتا ہوں کوشیا دیوی“

تم آج بار بار مجھے کوشیا دیوی کیوں کہہ رہے ہو؟ کوشیا نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ برا مان رہی ہے۔

”نہیں کہوں گا“ ہنسن جھک گیا۔

”کہہ بھی لو تو کیا ہے — کیا میں دیوی نہیں ہوں — اور جو نہیں ہوں تو بھی کیا بڑا ہے — لیکن تمہارے منہ سے یہ کچھ ٹھیک نہیں لگتا؟“ ہنسن نے معافی مانگ لی۔

”جھاؤ — کر دیتی ہوں معاف — اور وہ آگے بڑھ گئی؟“

فیوزے میں لوگ آہستہ آہستہ اپنا شروع ہو گئے تھے — ایک انگریز سڑک مرد کے ساتھ ایک افریقن لڑکی تھی۔ دونوں کے رنگ روپ میں دن اور رات کا فرق تھا۔ لیکن انگریز مرد افریقن لڑکی کو اس طرح رجھا رہا تھا کہ بیسہ اڑد کر کچھ چیزیں لاتے وقت پردہ سر کا کر رک جاتا اور کھٹکڑ کر انھیں موقع دیتا کہ انکے چھپاں ہونٹ الگ ہو جائیں۔

فیوزے کے دوسرے سارے لوگ از خود رفتگی کے اس عالم میں نہ تھے شاید اس لئے کہ فیوزے میں وہ بھی آئے تھے اور پینا شروع کئے انھیں دیر نہیں ہوئی تھی۔ ایک سردار جی اپنی سرداری کے ساتھ دنبے کا بٹھا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ سردار جی بہت ہی صحت مند اور دیدہ ورا آدمی تھے لیکن سرداری کا جسم لٹک گیا تھا اور وہ سردار جی کی بیوی ہونے کے باوجود ان کی بڑی بہن نظر آ رہی تھیں لیکن دو دو پیلے گلاب سرداری نے اپنے بالوں میں سجا رکھے تھے جو یقیناً سردار جی نے اپنے ہاتھ سے ان کے بالوں میں ٹانک دیے ہوں گے۔

اور بھی ادھر ادھر کچھ لوگ تھے۔ ہال میں سردار نی کے سوا کوئی عورت نہ تھی جو کھلے عام بیٹھی ہو۔۔۔ افریقن لڑکی اور انگریز مرد نے پردہ کھینچ رکھا تھا۔ کوشلیا شازو جہ اور دونوں مسافر بھی پردے ہی میں تھے لوگوں کی نظریں البتہ اس پردے سے بار بار ٹکرا رہی تھیں جس کے پیچھے سے کوشلیا کی بے باک سنسنی سارے فیوزے میں گونج رہی تھی اور ہال کے لوگوں کے کانوں میں اس گھول رہی تھی۔

لال بالوں والے نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے شازو جہ کے منہ سے پیسٹری یعنی چاہی۔۔۔ لیکن وہ جھٹ سے منہ میں ڈال کر سنسنی پڑا۔ کوشلیا نے پیار سے شازو جہ کو دیکھا اور گننے مسافر نے کوشلیا کا گلاس جس میں بیر کے ساتھ جن ملی ہوئی نہیں تھی اٹھا کر کوشلیا کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔۔۔ "شازو جہ کی سنسنی اور تمہاری مامتا کے لئے۔"

کوشلیا نے گلاس اپنے ہاتھ سے تھام لیا اور غٹا گئی۔ گننے مسافر نے بھی اپنا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور لال بالوں والے نے بھی اپنے خالی گلاس کا آخری قطرہ زبان پر ٹپکایا۔

"بناؤ جان۔۔۔ لال بالوں والے نے کہا۔

کوشلیا نے دونوں گلاسوں میں رم ڈال دی۔ دیکھو برابر ہے نا؟
 "ہاں جان۔۔۔ دونوں مسافروں میں سے کسی نے کہا۔ اور کوشلیا نے
 بیر کی دوسری بوتل کے لئے بیر کو پکارا

”ادہ ساری“ — دونوں مسافروں نے معافی چاہی۔
 بیرا آگیا تو گنجے مسافر نے کہا — ”ایک بوتل بیر — اور کھانے
 کے لئے تم بولو جان؟“

”زبان —“ ذرا مریچ زیادہ لگانا
 ”اور سیریم بہت ٹھنڈا“ لال بالوں والے نے اضافہ کیا۔
 ”اور سیریم سے بھی زیادہ ٹھنڈی“ — کوشلیا نے کہا۔
 ”اور تلا ہوا گوشت اور ابلے ہوئے انڈے“ — گنجے مسافر نے مزید کہا۔
 بیرا جا چکا تو لال بالوں والوں نے کہا —

”ڈار لنگ تم بہت سیر ہو — بیر پینے سے کیا خاک ہوگا۔“
 ”بہت کچھ ہوتا ہے۔ تم چونکہ دوسرے ہو اس لئے میں تمہیں تمہاری سطح پر
 نظر نہیں آ رہی ہوں۔“

”نہیں ڈار لنگ یہ سچ کہتے ہیں۔“ گنجے نے اصرار کرتے ہوئے کہا
 ”تم ہر گلاس کے ساتھ نصف پگ جن ملاؤ۔“
 ”ہاں ملا لوں گی۔ کیا برا ہے — لیکن تم لوگ مجھے دھت کر کے مجھ
 سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟“

”ارے نہیں جان — یہ کیا کہہ رہی ہو تم — لال بالوں والے نے بڑے
 چاؤ سے کہا جس کو کوشلیا اب ”ریڈش ڈیر“ کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھی۔

شانو جہ بکٹ آلیٹ اور پیٹری ختم کر چکا تھا اور ابھی ابھی اس نے لمبی جہا ہی لی تھی۔ ”نیند آرہی ہے اس کو“ — ریڈش ڈیر نے شانو جہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کوشلیا سے کہا۔

وہ شانو جہ سے مخاطب ہوئی — ”جائے گا کاکا کے پاس؟ — جانا راجا بیٹا — میں جلد آؤں گی — ان دونوں کو محل دے کر یوں بھاگ گئی — کوشلیا نے چٹکی بجا کر کہا — اور اپنے راجہ بیٹا سے الگ سو رہوں گی۔“

بیرا نے ٹھنڈی بیر میں آدھا پاگ جن ملا دیا — خالی پلیٹیں اٹھا کر بھری ہوئی میز پر سجادیں۔

کوشلیا نے آدھا گلاس ٹپاخ دیا اور بیر کو پکارا — ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تڑپ کر پردے پر نگاہ ڈالی جس کے پیچھے سے کوشلیا کی سریلی آواز آئی تھی۔ اور واقعی کوشلیا کی آواز اس کے جسم سے کچھ کم نہ تھی۔ کبھی کبھی کوشلیا کا سارا وجود ایک بنتا ہوا محسوس ہوتا تھا جو ردے ہاؤس، فیوزے ریٹورنٹ اور بھیل کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔

کوشلیا کی آواز پر اب کی بار سردار سچی بری طرح چونکے تھے اور سردار فی اپنے بالوں میں پہلے گلابوں کو ٹھیک کر لیا تھا۔ اس پر بھی اس سے رہا نہ گیا تو اس نے سردار سچی سے کہا۔

”یہ آواز اسی لڑکی کی معلوم ہوتی ہے جس نے جھیل پر پھول دیے تھے اور تم نے پھول لینے کے سہانے اسے تاکا تھا۔ اور اس کا بچہ کتنا پیارا سا ہے۔ وہ تو شوہر والی کوئی شریف عورت ہو گی نا؟“

سردارنی نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دیں تو سردار جی سوچنے لگے کہ اب انھیں بھی تو کچھ کہنا ہے۔
انہوں نے کہا۔

”واہا گر دو واہا گر دو۔ میں بھی تو اس بچے ہی کو دیکھ رہا تھا کیسے۔ اپنا بھی کوئی ننھا ہوتا۔“ اور سردار جی نے ٹھنڈی آہ بھری جو بریائی کے سامنے دھری ہوئی گرم پلیٹ سے ٹکرا کر گرم ہو گئی۔ لیکن سردارنی واقعی بچہ کر رہ گئی تھی۔

سردار جی پر جب بھی کوئی کڑا وقت آتا تو وہ سردارنی کی توجہ پھرنے کے لئے اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھالتے کہ سردارنی با بچہ ہے۔ سردارنی کا لٹکا ہوا جسم کچھ اور ڈھیل پڑ جاتا اور وہ جو کچھ سامنے دھرا ہوتا چپ چاپ کھا لیتی۔ سردار جی ایسے میں گنگنانے اور جوک باکس پر اپنا پسندیدہ گیت سننے میں مگن ہو جاتے ہیں

پردے کے پیچھے شانوجہ نے پھر جما ہی لی۔ اب تو اس کی آنکھیں بند رہ گئی تھیں۔

”جائے گا متا میرا“ — کوشلیا اس کو پچکارنے لگی۔

”نہیں جاؤں گا“ — تم نہ ہوگی تو ڈر لگے گا مجھے۔“ — شانوجہ بفسد تھا اور اپنے دونوں ہاتھ مینر کی سطح پر رکھے ہاتھوں پر سر ٹکائے سونے کے لیے مناسب نڈاویے کے لئے کوشاں تھا۔

ریڈش ڈیر نے گال تھپتھپاتے ہوئے شانوجہ سے کہا: ”کل ہم بابا کو بہت سے چاکلیٹ دلائیں گے۔“ چلو تمہیں کا کا کے پاس چھوڑ دیں۔“
شانوجہ بگڑا۔ ”نہیں“ — اس نے چیخ کر کہا۔

اور کوشلیا نے بھانپ لیا کہ اب زیادہ اصرار کرنے پر شانوجہ برہم ہو جائیگا۔ وہ جانتی تھی کہ شانوجہ کی برہمی کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ وہ جب اڑھتی ہے پر آتا تو پھر کسی کی اس کے آگے نہ چلتی تھی۔ پختا پختہ کوشلیا نے ریڈش ڈیر کو اشارہ کیا کہ وہ شانوجہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

کوشلیا کی آنکھوں میں بیر اور جن کا جس قدر نشہ تھا اس سے کہیں زیادہ شانوجہ نیند کے نشے میں چور تھا اور اسی لیے کوشلیا چاہتی تھی کہ اب شانوجہ اطمینان سے سو جائے۔

”ڈیر بالڈ“ — پی چکونا — کوشلیا نے انگڑائی لے کر اپنے جو بن کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”خصوصیات کا لحاظ رکھتے ہوئے نام عمدہ دیتی ہو۔“ — ریڈش ڈیر نے

کوشلیا کی تعریف کی اور اس کا ہاتھ چوما۔

”تمہیں کیوں نہ پیارے لال کہوں۔ یہ زیادہ اچھا رہے گا۔“

”خوب خوب۔۔۔ نام بھی دیتی ہو ترجمہ بھی کر دیتی ہو۔“

”ارے ہاں۔“ ڈیر بالڈ اپنی کرسی سے قریب قریب اچھل پڑا۔ شانوجہ ہی سے قسمت کا فیصلہ کروا لیتے ہیں۔

”ہاں یاد رکھیں وہ اپنی ماں کا حسن کس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ کاغذ چاہیے۔۔۔ چٹ لکھیں۔۔۔ ورنہ وہ سو جائے گا۔۔۔ قریح اندازی کا نیک کام اسی کے ہاتھ سے ہو جانا چاہیے۔“ پیارے لال کہہ رہا تھا اور اس کا چہرہ بالوں کی سرخی کا عکس معلوم ہو رہا تھا۔

”بیرا۔ بیرا۔ بیرا۔“ ڈیر بالڈ نے مسلسل پکارا اور پیارے لال نے ساتھ ہی گھنٹی بجادی۔

کاؤنٹر پر ہنسن چونکا۔ کیا بات ہو گئی آخر۔۔۔ وہ یوں بھی چاہتا تھا کہ اس کین کا ایک آدھ چکر لگا آئے تاکہ کوشلیا سے کچھ پھیر بھاڑ بھی ہو اور اس کے ساتھی بھی خوش ہو جائیں کہ فیوزے کا مالک ان کی طرف اتنی توجہ کر رہا ہے۔۔۔ پچا پنچہ وہ کین کی طرف چل پڑا۔

ہنسن کو دیکھ کر کوشلیا نے کچھ برا سامنہ بنایا۔ پیارے لال اور ڈیر بالڈ کو بھی اس وقت اس کا آٹنا کچھ ناگوار گزرا لیکن ہنسن نے جھک کر بڑے ادب سے

کہا کہ مسلسل پکارا اور گھنٹی کی آواز سے وہ خود چلا آیا ہے کہ کوئی بات انہیں ناگوار ہوئی تو اسے تو معلوم ہو سکے۔

”تھوڑا سا کاغذ بھجوا دیجئے“ ڈیر بالڈ نے ہینسن کو ٹالنے کے لئے کہا۔
 ”بہت اچھا۔۔۔ اور آپ کہیں تو ایک اور کرسی بھجوا دوں تاکہ دونوں کو ملا کر اس ننھے بیچارے کو سلا سکیں۔“ ہینسن نے شانوجہ سے ہمدردی کی۔
 کوشلیا کو ہینسن کی اس ہمدردی میں اپنے لیے طنز اور قضاہیک کا پہلو نظر آیا اور اس نے تنک کر کہا۔۔۔ میں اس کی ماں ہوں ہینسن۔“
 ”ہاں میں جانتا ہوں لیکن اس واقعے کے بعد تو تمہیں شانوجہ کی بہت حفاظت کرنی چاہیے۔“

کوشلیا نے ہینسن کو گھائل ہرنی کی طرح تڑپ کر دیکھا۔۔۔ ”ہاں اس کا اچھا برا میں جانتی ہوں۔ شکریہ؟“

ہینسن جان گیا تھا کہ کوشلیا پر بھرپور وار اس نے کیا ہے۔ اب مزید کچھ کہنے کی اس نے جرأت نہ کی۔ کیونکہ کوشلیا کا اگر موڈ خراب ہو جاتا تو وہ ایسے میں پہلے خاموش ہو جاتی ہے پھر رونے لگتی اور اچھی خاصی محفل اس طرح برباد ہو جاتی ہے۔ محفل کی اس طرح یکایک برخواستگی کے معنی یہ بھی تو ہوتے ہیں کہ کچھ اور مال جو ہک سکتا تھا وہ بکنے سے رہ جاتا چنانچہ وہ کاؤنٹر پر لوٹ آیا۔
 بیر کاغذ لے آیا تو کوشلیا کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

پیارے لال نے کاغذ پر دو نام لکھے — انہیں برابر برابر پھاڑ کر مرنے لگا۔
 کوشلیا اپنی انگلیاں شادوجہ کے بالوں میں بڑے پیار سے کنگھی کی طرح پھیر رہی
 تھی۔ اس کی آنکھیں شادوجہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کین میں بیٹھی ہی
 بیٹھی کین سے باہر دور کہیں چلی گئی تھی۔

ڈیر بالڈ نے جس پر مرنے اب اچھی طرح اثر جما لیا تھا کوشلیا کی کمر میں گدگد کر
 اسے مخاطب کیا۔

پیارے لال پر چیاں ٹیبل پر ڈال کر شادوجہ کو بیدار کرنے کی کوشش میں تھا۔
 اس کی آنکھیں بالکل منہ گئی تھیں اور وہ آسانی سے بیدار نہ ہوتا تھا۔
 ”اس کو موجدانے دو — کوشلیا نے پیارے لال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
 لیتے ہوئے کہا — اس کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا جائے یہی کیا کم ہے کہ اس نے
 مجھ جیسی ماں سے جنم لیا ہے؟“

”تم سو رہی ہو — ڈارلنگ —“ ڈیر بالڈ نے پھر اس کو گدگدایا۔
 کوشلیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی جا سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس کی آنکھوں سے
 نظریں پھیر لی جائیں۔

اور دونوں مسافروں نے صرف مسکراہٹ ہی دیکھی۔

”میں جن طیتی ہوں تم دونوں میں سے کسی کو —“ کوشلیا نے انگوٹھا اٹھائی کے
 پھنور میں مسکراہٹ کی کریمیں پھینک کر سب کچھ بھلا دیا اور اس طرح پھر اس مغل میں

لوٹ آئی جیسے فرض کی ادائیگی کے خیال نے اس کی بانہ پکڑ کر اس کو غفل میں ڈھکیل دیا ہو۔

ڈیر بالڈ اور پیارے لال اپنی اپنی نشستوں پر سیدھے بٹھ گئے۔
 ”جائتم — رحم کا طلب گار ہوں“ — ڈیر بالڈ نے جھک کر کوشلیا کے
 پیر چھو لئے۔

”یوں نہ کرو“ — اس نے اپنے پیر پٹاتے ہوئے کہا — ”میں تمہارے
 حق میں ہی فیصلہ کئے دیتی ہوں۔“

”سچ پانچ یوں نہ کر دینا“ — پیارے لال نے التجا کی۔ ”ورنہ میں جھیل میں
 ڈوب مروں گا۔“

کوشلیا مسکرائی — ”کون کسی کے لئے جھیل میں ڈوبتا ہے بابا۔ بالکل
 یہی بات چھ سات سال پہلے مجھ سے کسی نے کہی تھی — پھر وہ آج تک نہیں
 بولتا۔ اور میں اکیلی جھیل میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کے لیے رہ گئی ہوں۔“
 یہ کہتے کہتے کوشلیا کی آنکھیں بھیک گئی تھیں لیکن وہ برابر مسکرائے جا رہی تھی۔
 پیارے لال نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے — ”تم جذباتی ہو گئی ہو۔
 مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے — معاون
 کر دو ڈار لنگ۔“

کوشلیا نے مسکراہٹ کو قبضے میں اس طرح بدل دیا — جیسے

یہ سب کچھ اس کے بس میں ہے۔

”تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو۔“ کوشلیا نے ایک ادائے دلبری سے کہا۔
 ”میرے آنسو اور میرے قہقہے تو ام بچوں کی طرح ہیں — دونوں اتنے ملتے ہیں کہ
 انھیں پہچاننا مشکل ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں قہقہے مار کر سنستی ہوں تو رو رہی
 ہوتی ہوں اور جب آنسو چھپاتی ہوں تو گویا مسکراہٹ چھپاتی ہوں — اب
 بتاؤ ڈیر کیا تم میری ان باتوں کو مان لو گے؟ — تمہیں ایک اور بات بتاؤ۔“
 ڈیر بالڈ نے خالی گلاس نحو دی بھر دیے۔

کوشلیا اب چکنے کے موڈ میں آگئی تھی — شان و جہ آرام سے سو رہا تھا۔
 پیارے لال کوشلیا کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ بہت
 متاثر ہے — ڈیر بالڈ کی بس یہی خواہش تھی کہ کوشلیا جلد از جلد قرعہ فال
 اس کے نام نکال دے۔

چنانچہ بھرے ہوئے گلاس ہر ایک کے سامنے رکھتے ہوئے ڈیر بالڈ نے کہا۔
 ”جام اٹھاؤ — اس لمحے کے نام جو اب مقدر بننے والا ہے۔“
 سب نے تھوڑی تھوڑی سی سب کی۔

پیارے لال نے یاد دلایا کہ کوشلیا کچھ کہہ رہی تھی۔
 لیکن ڈیر بالڈ اب کچھ اور سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ صاف صاف کہہ رہا
 تھا کہ کوشلیا پہلے قسمت کا فیصلہ کر دے پھر اطمینان سے باتیں کرتی رہے۔

”تو تیار ہو جاؤ۔“ کوشلیا نے بھرپور انگڑائی لے کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔
 دونوں مسافر جو اب کوشلیا کے گہرے دوست ہو گئے تھے ایک دم اس
 طرح اپنی اپنی نشستوں پر تن گئے جیسے اپنے بو بھل ذہن سے نشہ کی کیفیت
 کو زائل کر چکے ہوں۔

کوشلیا نے ایک ادائے دلبری سے ہاتھ بڑھایا اور ایک پرچہ اٹھا کر پلک
 جھپکنے میں کھل دیا۔

”ڈیر بالڈ — لو میں تمہاری ہو گئی ہوں۔“

ڈیر بالڈ اپنی کرسی پر سے اچھل پڑا — وہ کھڑا ہو گیا — پھر وہ کوشلیا
 پر جھکا — پھر کوشلیا نے اپنے ہونٹ ڈیر بالڈ کے ہونٹوں میں دسے دیے۔
 پیارے لال مسکراتا رہا — اس کی نظریں اس اثناء میں بار بار شانوجہ
 پر پڑتی رہیں اور شانوجہ بے خبر سوتا رہا۔

کوشلیا نے ایک دلیر مسکراہٹ کے ساتھ ڈیر بالڈ کو دونوں ہاتھوں سے کرسی پر
 ڈھکیلتے ہوئے کہا — ”چلو اب بیٹھو کچی — بہت بے صبر ہے ہو۔“

پیارے لال سے کوشلیا اور ڈیر بالڈ نے SORRY کہہ کر معافی مانگ لی۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ پیارے لال نے اس طرح کہا جیسے انتقاماً کہہ رہا ہو۔

کوشلیا نے چھپڑا — تم تو جھیل میں ڈوبنے والے تھے نا ڈیر۔
 ”لیکن تم اب کچھ گھنٹوں کے بعد میری بھی تو ہو جاؤ گی — جھیل میں ڈوب کر

ہمیشہ کے لئے تم سے محروم ہونا مجھے گوارا نہیں۔“

کوشیلیا نے قہقہہ لگا کر ڈیر بالڈ سے مصافحہ کیا — اور تینوں ہنس پڑے۔
ہال میں اکثر نظریں اس پردے کی طرف اٹھیں جس کے پیچھے سے قہقہے کا چھنکا کا
باہر تک آکر بکھر گیا تھا — لیکن سردارنی اپنی زلفوں میں گلاب کے پیلے پھول
درست کرنے کے لئے اپنی نشست پر موجود نہ تھی اور نہ ہی سردار جی تڑپ کر
اس طرف دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھے۔

انگریز نثر اور سٹ بھی اپنی افریقن محبوبہ کے ساتھ جا چکا تھا اور اس کے
پارٹیشن کا پردہ سمٹ کر ایک گوشے میں اس طرح جھول رہا تھا جیسے ان کے
رومانس کی کہانی اپنی سلوٹوں میں پھپھکے ہوئے ہو۔

ہال میں لوگ کم رہ گئے تھے اور ان کے آخری جام ان کے ہونٹوں کے منتظر تھے۔
ہنسن کو ذرا سی فرصت مل گئی تھی اور وہ کاؤنٹر سے لگی اونچی سے کرسی پر ایک
ڈرائٹیک لگائے کر سیدھی کر رہا تھا۔

پردے کے پیچھے ڈیر بالڈ سب سے زیادہ مضطرب تھا — وہ چاہتا تھا کہ جلد
از جلد فیوزے کو چھوڑ دے اور پردے کیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۳ میں اس کے
بستر اور پیارے لال کے بستر کے درمیان وہ دبیر سائیل پردہ کھینچ کر تن جلے جو دیوار
سے لگا کونے میں جھول رہا تھا۔

ڈیر بالڈ نے ایک تجویز رکھی — ”تم جاہو تو آج رات بالکل دست بردار

ہو سکتے ہو۔ کل صبح میں چلا جاؤں گا۔ تم رک سکو تو رک جاؤ۔ آج کے سارے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔“

فیودے کے بل میں بھی میں تم سے کچھ نہیں لوں گا“ اس نے پیارے لال کے کندھے پر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ رکھا جو اپنے لال بالوں کو اپنی سفید انگلیوں سے سلجھا رہا تھا۔ ”کیا ہم دوست ہو کر ایک دوسرے کے لیے اتنا نہیں کر سکتے؟“

پیارے لال کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بڑے وقار اور تمکنت سے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔ ایک رات میں، کسی عورت کا ایک سے زیادہ مردوں کے پاس رہنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم بالکل جانور ہو گئے ہیں اور پھر تمہارا جھوٹا تمہاری ہی جھوٹی پلیٹ میں مجھے کچھ گوارا بھی نہیں ہے۔ جھوٹا تو ویسے تم بھی کھا رہے ہو، میں بھی کھاؤں گا لیکن یہ احساس تو نہ رہے گا کہ پلیٹ بھی جھوٹی ہے۔ رات کی تاریکی کے بعد دن کا اجالا عورت کو اتنا ستھر کر دیتا ہے کہ وہ آنے والی رات کی سیاسی کو پھر اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے بڑی پرکشش اور خوبصورت بنا دیتی ہے ورنہ یوں لگتا ہے جیسے ہم دلدل میں چل رہے ہیں۔“

ڈیر بالڈ اتنا لمبا چوڑا پچر سننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ اس نے بڑی

گرم جوشی سے پیارے لال کا ہاتھ دبایا۔ ”شکر یہ میرے فلسفی دوست
میں خوش ہوں۔ اور اس نے کھڑے ہو کر اپنے دوسرے ہاتھ سے بیڑ کا گلا
اٹھایا اور جھک کر کوشلیا کے منہ سے لگا دیا۔ پھر سب ہی کھڑے ہو گئے۔

ڈیر بالڈ نے شان و جہ کو اٹھا کر اسے کاندھوں پر سلا لیا۔ کوشلیا اس
کے ساتھ ایسی لگی لگی چل رہی تھی کہ دیکھنے والوں کو تینوں باپ، ماں اور بچہ نظر
آتے تھے۔ کوشلیا کے چہرے پر اس وقت ایک ایسی خواہش اور تمنا کی پرچھائیاں
تھی جو حسرت بن گئی تھی لیکن پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ ڈیر بالڈ سے کچھ
اس ادا سے بات کر رہی تھی، جیسے بیوی اپنے میاں سے اس وقت بات کرتی ہو
جب وہ ان کا بچہ اٹھائے چل رہا ہو اور دل ہی دل میں ماں کے لاطیہ پر برہم
ہو جو اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے گھر پر چھوڑ کر نہیں نکلتی۔

کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو پیارے لال نے مسکرا کر کوشلیا کو چھیڑا۔

”آپ شاید میرے دوست کی منتر ہیں؟“

کوشلیا نے اس طنز کو بھانپ لیا۔

”اگر ہوتی تو شاید تم کو بڑا دکھ ہوتا۔“

”ہو تو سکتا تھا۔ اس لیے کل تم میرے ساتھ بھی اسی طرح قدم سے

قدم ملا کر چلنے والی ہو۔“

”میں تو آج بھی چلنے کو تیار ہوں لیکن تم مجھے کتنی دور لے جاسکتے ہو۔“

یہی نایفوزے سے برودے لے تک اور اس کے بعد تم مردوں کے پیر ڈنگ کا جاتے ہیں۔

پیارے لال چاہتا تو مسکرا بھی سکتا تھا اس نے سنجیدگی کا لحاظ اور سے رکھا۔

ہنسن نے بل کی رقم لینے کے بعد جھک کر ڈیر بالڈ اور کوشلیا کا شکریہ ادا کیا، اس نے یہ بھی کہا کہ کوشلیا کی رفاقت میں ڈیر بالڈ کی زیاد گار بن جائیگی جس کا وہ متمنی ہے۔

”گڈ نائٹ — گڈ نائٹ — جب وہ لوگ جدا ہوئے تو پیارے لال پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔ وہ فیوزے کے احاطے سے گزر کر اس سڑک پر آگیا جو برودے کو جاتی تھی۔ رات نہ اتنی تاریک تھی، نہ اتنی اجلی — سڑک کی روشنیوں سے سٹنے پر بھی صورتیں بہ آسانی پہچانی جاتی تھیں — ہواؤں میں خنکی تھی۔ نارے اس طرح آپس میں اشارے کر رہے تھے جیسے زمین کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں لیکن زمین اپنی جگہ مطمئن تھی گویا ستاروں کی بے بضاعتی کو جانتی ہو۔

پیارے لال سیدھی سڑک پر کھڑا ہاں تک دیکھ رہا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ میں سڑک برودے کی طرف اس طرح مڑ گئی تھی جیسے چھپ کر جا رہی ہو۔ فیوزے کے احاطے میں پہنچ کر کوشلیا نے خنکی خموس کی تو اس نے ڈیر بالڈ

سے کہا۔ شانو کو کچھ اڑھالینا چاہیے لیکن یہاں ہو کیا؟ بہتر یہ ہے کہ تم اس کو تجھے دے دو۔ میں اپنا آپخل اڑھالوں گی۔

”میں اپنا کوٹ بھی تو اڑھال سکتا ہوں“۔ اس نے شانوجہ کو کوشلیا کی گود میں دے کر اپنا کوٹ کی اندرونی جیب سے کچھ نوٹ اور کاغذ نکالے اور اپنی شرٹ کی جیب میں محفوظ کر کے کوٹ اتار لے لگا اور ساتھ ہی دوسری جیب کی زپ کو چھو کر اس نے دیکھا کہ زپ برابر ہے۔ کوشلیا نے شانوجہ کو پھر اس کی گود میں داپس دے کر کوٹ اڑھال دیا۔ پھر ایسی نظروں سے اس کو دیکھا جیسے پیار کر رہی ہو۔

”تمہارے کتنے بچے ہیں پیارے؟“ کوشلیا نے اس طرح پوچھا کہ اس ایک جملے سے جیسے شانوجہ پر ڈیر بالڈ کی مہربانی کا اعتراف کر رہی ہو۔ ”تم ہی بتاؤ کتنے ہو سکتے ہیں“۔ ڈیر بالڈ نے کوشلیا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کو اپنے سے قریب تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”بھلا میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تم یقیناً ایک اچھے شوہر ہو گے اور ایک اچھے باپ بھی۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں لیکن میری بیوی اور میری بچی کوئی دو سال سے مجھ سے جدا ہیں۔ میری آمدنی سے ان کی گزر بسر کے لیے ایک حصہ کٹ جاتا ہے۔ میں اس کے علاوہ بھی انھیں کچھ بھیجتا ہوں۔ بچی ہانی اسکول

میں پڑھتی ہے اور بیوی ایک خانگی کالج میں پڑھاتی ہے۔
 ”اتنی پڑھی لکھی سے تمہاری بیوی؟“

”پڑھا لکھا تو اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ سب جاہل ہیں اور
 سب ایک دوسرے پر فوقیت جتاتے ہیں۔ بہتیں وہ یاد نہیں آتے؟“
 ”آتے ہیں۔ بیٹے ہوئے دنوں سے پٹا ہوا وہ کمر آدمی زیادہ سے
 زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا سب کچھ بھول جانے میں عافیت ہے۔ ہم ہر
 یاد کا گلا گھونٹ کر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی کی دلہن سے
 بار بار بیاہ کرتے ہیں۔“

”لیکن کیا ایسا کر کے تم مطمئن ہو جاتے ہو؟“

”یقیناً ہو جاتا ہوں۔۔۔ تم نے دیکھا نہیں میں ابھی ابھی کچھ دیر پہلے
 مطمئن تھا۔ فیوزے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ باہر کی
 خشکی اور تمہارا ساتھ میرے نشے کو اوپر اٹھائیں گے لیکن تم نے بے وقت
 کی راگنی چھیڑ دی۔ اس سے اتنا تو ہو ہی گیا کہ میں نے تمہاری باتوں کا سنجیدگی
 سے جواب دے دیا۔ اور یہ سنجیدگی میرے نہ چاہنے کے باوجود تم نے مجھ
 پر مسلط کر دی۔ حالانکہ میں نے فیوزے میں اس بات کو کسی بار محسوس کیا
 تھا کہ تم بیٹھی بیٹھی کہیں کھو جاتی ہو۔ پھر کسی معمولی بات پر اس طرح
 قہقہہ لگاتی ہو جیسے کھل کر ہنستا تمہاری فطرت ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔“

اس کے باوجود میں نے تمہیں ماضی کے رنگستانوں میں بٹھکنے نہیں دیا ہے اور کھینچ کھینچ کر فیوزے میں لے آیا ہوں۔ اگر میں تم سے پوچھ بیٹھتا کہ شانوجہ کا باپ کہاں ہے اور اس کے بعد تم سے پھر کچھ نہ پوچھتا تو بھی تمہیں رات بھر لانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے تمہارے پیارے لال کیلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ شانوجہ سے متعلق کوئی سوال نہ کرے۔ اس لیے کہ کسی عورت سے اس کے بچے سے متعلق جبکہ اس کے شوہر سے ہم متعارف نہ ہوں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ شرافت کا تقاضہ بھی ہے اور اس عہد کے سچے عشق کا تقاضا بھی لیکن جب وہ بھیل پر تم سے پہلی بار ملا تھا اس وقت سے وہ جاننا چاہتا تھا کہ شانوجہ کا باپ کہاں ہے کون ہے۔ اس نے تمہارے متعلق ہینین سے تھوڑا بہت سن رکھا ہے۔ کہتا تھا تم انٹریاس ہو۔ کالج کی زندگی سے ایک ہی جست میں تم نے "فیوزے" اور "برودے" کے فاصلے طے کر لیے ہیں۔ میں نے اس کو جھاڑ دیا تھا۔ ڈر تھا کہ میری آج کی رات تمہارے جذبات کے ہاتھوں پامی نہ جالے۔ اس لیے کہ جب عورت روتی ہے تو اس کے آنسو مرد کی جھنسی آگ پر پانی کا نہیں تیل کا کام کرتے ہیں۔ اور وہ آگ جوتیل ڈالنے سے بھڑک جاتی ہے جلد بجھ جاتی ہے اور مجھے تو اپنے لگائے ہوئے پیسے کی قیمت زیادہ سے زیادہ اس ایک رات ہی میں تم سے وصول کر لینی تھی۔"

”اب بھی کیا گیا ہے، وہ تو تم وصول کر سکتے ہو۔“ کوشلیا نے بُرا مانتے ہوئے وار کیا۔

”سگریٹ ہیں تمہارے پاس؟“ پیارے لال نے ڈیر بالڈ سے پوچھا جو لوٹ کر فیوزے کے احاطے کی بیرونی دیوار سے لگا شاید پیشاب کر رہا تھا۔ جب وہ ڈیر بالڈ کی طرف بڑھا تو اس کو ڈیر بالڈ نے اپنی پتلون کا آخری بٹن لگاتے دیکھا۔ جب وہ قریب آ گیا تو ڈیر بالڈ نے کوشلیا سے کہا کہ وہ اس کی پتلون کی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر پیارے لال کو پیش کرے۔

کوشلیا نے اپنا ہاتھ اس کی پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے لمحہ بھر کو کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے وہ یقیناً ڈیر بالڈ کی خوبصورت بیوی ہے جس کو وہ بہت چاہتا ہے۔ اور شانوجہ۔ شانوجہ۔ کوشلیا کا جی چاہا کہ بھاگ کر کہیں چلی جائے۔ اور ڈیر بالڈ تعاقب کرنے لگے تو چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتلائے کہ وہ ڈیر بالڈ کو جانتی ہے نہ شانوجہ کو۔ شانوجہ میرا بچہ نہیں ہے۔ میں تو وہ عورت ہوں۔ وہ عورت ہوں جسے لوگ جھیل کی پری کہتے ہیں اور کوئی بھی ایک معقول معاوضے پر مجھے اپنے ساتھ۔ اپنے ساتھ۔

”کہاں پہنچ گئی ہو۔“ ڈیر بالڈ نے اس کو گدگدایا۔ ”دیکھتی نہیں ہو“

پیارے لال سگریٹ کیس لوٹا رہا ہے۔
 وہ چونکی، سگریٹ کیس لے کر اس نے ڈیر بالڈ کی جیب میں اس طرح
 دکھایا کہ دیر ہونے پر جیسے اس کا ہاتھ جھلس جائے گا۔

پیارے لال نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کے دائرے پھینکتے ہوئے
 ظاہر کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے حالانکہ وہ ضرور کچھ سوچ رہا تھا
 — یکایک اس نے کہا — ”میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ رات ہی رات
 شہر لوٹ جاؤں، ایک ٹرک جانے والا ہے، ایک آدمی کی جگہ بھی ہے
 لیکن اس کو نکلنے میں ابھی دو گھنٹے ہیں۔ یہ دو گھنٹے جوں توں کر کے میں
 بروڈے میں کہیں گزروں گا۔“

”تمہیں کیا ایک یہ سب کچھ کیا سوچھا ہے۔“ ڈیر بالڈ نے پیارے لال کے
 کندھے پر اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ دھرتے ہوئے پوچھا ”کو شلیا
 کی رات بھر کی جدائی شاید تمہیں گوارہ نہیں۔ یا پھر میری رفاقت کھل رہی
 ہے گویا تم اچھے رقیب بننے کے اہل نہیں ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ ڈیر بالڈ نے بڑی رکھائی سے کہا
 اور سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر دھواں ہوا میں پھینک دیا۔

”اچھا چلو آج رات کو شلیا میں تمہیں دے دیتا ہوں — اب کہو
 کیا کہتے ہو۔“

”نہیں جی یہ تو سراسر تم پر ظلم ہو گا۔“ پیارے لال نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں یہ شرط مجھے قبول ہے۔

لیکن کوشلیا کے سینے میں ایک برجی سی لگی۔ اس نے یکجہ اس طرح تھام لیا جیسے سینے میں پوست برجی کو سنبھال رکھا ہو۔ کوندے سے اس کے ذہن میں لپک گئے۔ تم نے شانوجہ کو اٹھا کر کس چاؤ سے اپنے کندھے پر سلا لیا۔ تم نے اپنا کوٹ اتار کر کس پیارے اس کو اٹھالیا۔ تم نے اپنی حبیب سے سگریٹ کیس نکلوایا اور میں اپنے اطراف خوابوں کا ایک جال بن کر اس میں جا چھپی۔ ایک رات صرف ایک رات میں اس جال میں رہنا چاہتی ہوں جو میں نے بن لیا ہے۔ اور تم۔ تم مجھے پیارے لال کے پاس بطور تحفہ پیش کر رہے ہو۔ گویا تم مجھے خرید بھی سکتے ہو اور جب چاہو کسی اور کی گود میں پھینک بھی سکتے ہو۔ یہ حق تمہیں کس نے دیدیا ہے۔ کس نے دیدیا ہے۔ ذہن میں کوندوں کی لپک ختم ہوئی تو کوشلیا نے جیسے ہوش میں آ کر ڈیر بالڈ کو دیکھا۔ اور وہ ہم کی طرح پھٹ پڑی۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے دوسروں کے پاس پیش کرنے والے۔ میں کوئی مٹی کا کھلو نا نہیں ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں جس کے ساتھ چاہے سو سکتی ہوں جب ساتھ چاہے نہیں۔ تم کوئی پیشہ ور لال معلوم ہوتے ہو۔“

کوشلیا بڑھی۔ اس نے شانوجہ کو ڈیر بالڈگی گود سے چھین لینا چاہا۔ لیکن ڈیر بالڈ نے شانوجہ کو چٹائے رکھا اور ایک لفظ کہے بغیر سڑک پر بروڈے کی جانب چل پڑا۔

تینوں نے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ بروڈے گیسٹ ہاؤس کے قریب پہنچے تو کوشلیا نے محسوس کیا کہ ڈیر بالڈ ہانپ رہا ہے۔ شانوجہ کو اٹھا کر اتنی چڑھائی چڑھنے میں وہ یقیناً تھک گیا ہو گا۔ کوشلیا نے اپنے اطراف پھر جال سا بننا شروع کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ ڈیر بالڈ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کے گنجنے سر کو سہلائے اور اس سے کہے کہ سو جاؤ کہ تم تھک گئے ہو۔

نیوزے سے بروڈے گیسٹ ہاؤس کا راستہ طے کرتے وقت وہ ڈیر بالڈ اور پیارے لال سے ہٹ کر الگ الگ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ جب وہ درختوں کے اس جھنڈ کے قریب پہنچے تھے تو اسے رات زیادہ سیاہ اور مہیب نظر آ رہی تھی کیونکہ سڑک پر بجلی کے کھمبے کا بلب ٹوٹ گیا تھا اور اندھیرے بڑے گہمیر ہو گئے تھے۔ گھٹے درختوں کے نیچے سڑک بالکل چھپ گئی تھی۔ اور اوپر نگاہ اٹھانے سے آسمان پر تاروں کی کھیتی بالکل نظر ہی نہ آتی تھی۔ رات کو جب کبھی کسی مسافر کے ساتھ کوشلیا اس راستے سے گزرتی تھی تو اپنے ساتھی کے بالکل قریب ہو جاتی خواہ

راستے کا بلب جل ہی کیوں نہ رہا ہوتا اور وہ موڑ پر ہی میں کیوں نہ ہوتے
 — ان درختوں میں اُس کو کھائی کی اس دوشیزہ کی روح اپنے محبوب
 کے انتظار میں بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جس کی کہانیاں خوفناک
 کھائی سے وابستہ رہیں اور برودے سے فیوزے تک جن کا چرچلہ ہے۔
 ایک دوٹھا اپنی نئی نویلی دلہن کو سول میرج کر کے ہنسی مٹون کے
 لیے برودے ہاؤس لے آیا تھا۔ لڑکی اپنے میکے سے جتنا بن پڑا روپیہ
 اور زیورے کر بھاگ آئی تھی۔ دس دن ساتھ رہنے کے بعد لڑکا زیورہ
 اور نقدی لے کر فرار ہو گیا۔ لڑکی کے پاس ہاتھ میں صرف ایک انگوٹھی
 تھی۔ انگوٹھی بیچ کر تین روز تک وہ اپنے محبوب کے انتظار میں گزر بسر کرتی
 رہی۔ کوئی کہتا ہے کہ پانچ دن اُس نے انتظار کیا — آنجنابی ٹھاٹھ
 بلرام سنگھ جو برودے کا صدر چوکیدار تھا کہتا تھا کہ وہ بڑی بدتر لڑکی تھی۔ لڑکے
 کے چلے جانے کے بعد ٹھاٹھ کو دن رات روتا ہوا دیکھ کر حیران رہتا تھا کہ
 آنکھیں اتنا جل، اتنا نیر کہاں سے لے آتی ہیں۔ اور جب یہ آنسو خشک ہوئے
 جب یہ زل جل سوکھا، تو لڑکی نے جیون بنا ہونے کی شکست کھو دی — شام کو
 بھری شام کو، اُس نے اُس کو کھائی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا، اُس کھائی
 میں جس میں جھانک کر دیکھنا بھی کسی کے نُس کی بات نہ تھی۔ اور پھر اُس نے
 کوئی آواز تک نہیں سنی یہ سب کچھ اُس کی نظروں کے سامنے اس قدر چُپ

چاپ ہو گیا کہ نہ کوئی سیخ ابھری اور نہ شام کا جادو ٹوٹا۔ آنجنابی صفا کمر
 بلام سنگھ کہتا تھا کہ "بیٹا کوش" میں تو آج بھی اُس کی روح کو اُداس اُداس
 برودے کے احاطے میں گھومتا ہوا دیکھتا ہوں درختوں کے اس جھنڈ میں سر
 جھکائے کھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ کھائی میں حسرت لگاتا ہوا دیکھتا ہوں۔

اور کوشلیا کو محسوس ہوا تھا کہ درختوں کی جھنڈ سے کوئی اُس کی طرف بڑھ
 رہا ہے لیکن اُس نے نہ تو ڈیر بالڈ کا ہاتھ تھاما نہ اُس کے قریب ہی گئی۔
 پیارے لال تو خود ہی آگے آگے جا چکا تھا اور پھر اُس کی قربت کا تو کوئی سوال
 ہی نہ تھا۔ اس وقتی اُداسی نے کوشلیا کو باہمت بنادیا تھا، اتنا باہمت کہ
 وہ ڈیر بالڈ سے کچھ اندر زیادہ پیچھے رہ جاتی تب بھی شاید نہ ڈرتی۔

فیوزے سے باہر نکلتے وقت کوشلیا نے دیکھا تھا کہ جھیل کے پیلے گلاب
 ڈیر بالڈ نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لئے تھے جواب یقیناً ٹوٹوں اور کاغذوں
 کے نیچے دب کر مڑ بھاگے ہوں گے۔

آج کی رات کے لیے جب ڈیر بالڈ نے پیارے لال سے اُس کو جیتا تھا تو
 اپنا گلاب بھی پیارے لال نے ڈیر بالڈ کو یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ اس کی پکھڑیاں
 نوچ کر بستر پر کوشلیا کے نیچے پکھا دینا۔ اور کوشلیا سوچ رہی تھی کہ کھٹا کر
 بلام سنگھ جب تک زندہ تھا برودے کا یہ دستور بن گیا تھا کہ لوگ جھیل سے جو
 پھول لے آتے وہ برودے پہنچنے سے پہلے راستے میں اس خوفناک کھائی کی نذر

کر دیتے گویا کھائی کی دو شیرزہ کے لیے یہ پھول محبت کا تحفہ ہوتے اور اس کے
 بعد بلرام سنگھ مسافروں اور ٹورسٹوں کے جوڑوں سے کہا کرتا کہ آج رات اُن کے
 لیے مسرتوں اور شادمانیوں کی رات ہوگی۔ لیکن لوگ آہستہ آہستہ اب اس
 دستور کو بھولتے جا رہے تھے۔ آنے والے مسافروں کو کھائی کی دو شیرزہ کی
 آنکھوں دیکھی کہانی سنانے والا بلرام ٹھاٹھا کر جب سے سرگیاشی ہوا تھا کھائی کی
 داستان لوگوں کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کوشلیا جب بھی کسی کے ساتھ
 ہوتی وہ اُس کو یہ کہانی ضرور سناتی اور اُس کا ساتھی کھائی کی طرٹ پھول پھینک
 دیتا جو کبھی کھائی میں کبھی قریب ہی اوپر گر جاتے۔ صبح کو اب بھی باسی پیلے
 گلاب کھائی کے رہانے پر دیکھے جاتے ہیں کبھی اُن کی تعداد بہت ہوتی تھی۔
 کوشلیا کا جی چاہا کہ ڈیر بالڈ روک کر کہہ دے کہ جیب سے پھول
 نکال کر بیدھے ہاتھ سے کھائی کی طرٹ جتنی قوت سے پھینک سکتے ہو
 پھینک دو۔۔۔ ورنہ آج کی رات ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کر
 سکیں گے، کوئی شے ہمارے درمیان حائل ہو جائے گی۔ لیکن اس نے
 ڈیر بالڈ سے کچھ بھی نہ کہا حالانکہ آج تک جتنے مسافر آئے تھے ان کے
 تعلق سے کبھی بھی کوشلیا کے دل میں وہ جذبہ نہ ابھرا تھا جو آج ڈیر بالڈ
 نے اس کے اندر بیدار کر دیا تھا اور جس کا نہ وہ صحیح تجزیہ کر پاتی تھی نہ کوئی
 صحیح نام دے سکتی تھی۔

برودے کے سب ہی کمرے بھرے ہوئے تھے۔ بعضوں کے دروازے بند تھے اور روشنیاں مدھم تھیں جو کھڑکیوں اور روشن دانوں سے چھین رہی تھیں۔ ایک دو کمرے میں تیز روشنیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ ان میں لوگ یا تو تاش کھیل رہے ہیں یا پی رہے ہیں۔

پیارے لال پہلے ہی کمرہ نمبر ۳ پر پہنچ چکا تھا اور تالا کھول کر اندر بھی داخل ہو گیا تھا، باغ میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے بجلی کے قمقموں کی روشنیاں چھوٹے بڑے درختوں کے گھنے اور کم گھنے سایوں سے مل جل کر گزگاہی کا سادکشاں پیش کر رہی تھیں۔ فضا میں پر اسراریت سی چھائی ہوئی تھی۔

”شانو“ کو کمرے میں سلا دو ”کوش“ ڈیر بالڈ نے پتھر کے لمبے اور ٹھنڈے صوفے کی پشت پر باتھ ٹیک کر کہا اور جب وہ شانو جہ کو اپنی گود میں لے چکی تو ڈیر بالڈ نے اپنا کوٹ اس کو پھراڑھا دیا۔

”اس کی اندرونی جیب میں جس پر زپ لگی ہے بہت سے پیسے ہیں ذرا احتیاط کرنا۔“ ڈیر بالڈ نے کوشلیا سے کہا تو وہ جاتی جاتی رک گئی۔

”تم اپنے پیسے نکال کیوں نہیں لیتے۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو۔“ زیادہ بڑا اس مجھے نہیں سنا ہے۔“

کوشلیا نے منٹ بھر ڈیر بالڈ کو گھور کر دیکھا۔ اور سر جھکا کر شانو جہ

کو اٹھائے چپکے سے کمرے کی طرف چلی گئی۔

پیارے لال کمرے میں نہیں تھا۔۔۔ وہ شاید لیوٹری میں ہو گا۔ کوشلیا کو اس کی غیر موجودگی اچھی لگی۔۔۔ وہ ہوتا تو یقیناً مجھے تنہا کر کچھ نہ کچھ بات کرتا۔۔۔ اور میں کسی سے بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔۔۔ اس نے جھٹ سے شانوجہ کو پلنگ پر سلا دیا۔ پائنٹی پڑا ہوا الحاف کھول کر اڑھا دیا اور کوٹ کندھے پر ڈالتے ہوئے اندرونی جیب کو احتیاط سے چھو کر اس نے دیکھ لیا کہ زب برابر لگی ہوئی ہے۔ زب تیزتر قدم اٹھاتی باہر نکل گئی ڈیر بالڈ ٹھنڈی پتھر ملی پنچ کی پشت پر دونوں بازو پھیلائے ٹپک لگا کر بیٹھا ایک طرف کو گھور رہا تھا۔ اس کو خبر نہ ہوئی کہ کوشلیا اس کے اس قدر پاس آگئی ہے۔

”کوٹ پہن لو۔۔۔ ٹھنڈی پنچ پر کب تک بیٹھ گئے۔ اندر چلتے کیوں نہیں؟“
ڈیر بالڈ چونک کر جیسے دور سے لوٹ آیا۔ مجھے تو گرمی لگ رہی ہے۔
تم پہن لو کوٹ۔ آؤ تمہیں پہنا دوں۔“

اس نے بیٹھے بیٹھے کوٹ کو شلیا سے لے کر کھول دیا۔ کوشلیا نے بغیر کچھ کہے اس کی جانب پشت کر کے ہاتھ استینوں میں ڈال دیے۔

”ایک کام۔۔۔ ڈیر بالڈ نے جما ہی لیتے ہوئے کہا۔“ یہ چاہیاں لے جاؤ۔ میرا سوٹ کیس کھول کر ایم کا پائرنٹ اس میں سے نکال لاؤ۔“

دو گلاس بھی لیتی آنا۔ تم نے میرا ساہانٹہ ہرن کر دیا ہے۔ آخر تم مجھے اپنا کیا سمجھنے لگی ہو۔ اور ہاں سنو۔ بلونت کو بھی بلا لانا اگر وہ آنا چاہیے۔
 ”تو ان کا نام بلونت ہے۔“

”تم نے پیارے لال کی بجائے ”ان“ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ تم اس غریب کے لیے وجہ خفا ہو۔“

”میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔ میں کون ہوتی ہوں خفا ہونے والی“
 ”کچھ نہ ہو کر بھی تم خفا ہو جاتی ہو۔ یہی تو تمہارا کمال ہے۔“
 ”کچھ بھی ہو اب میں کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ وہ یقیناً مجھے تنہا پا کر مجھ سے بات کرے گا اور میں کسی سے مثنی مذاق کئے توڑ میں نہیں ہوں۔“
 ”تو پھر وہ اس وقت کہاں تھا جب تم گئی تھیں۔“
 ”وہ نہیں تھا۔ غالباً بیوٹری میں ہو گا۔“

”مسافروں اور ڈوسٹوں کا دل بہلانا جب تمہارا پیشہ ہے تو تمہیں اس قدر زود رنج نہیں ہونا چاہیے۔“

”یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ ویسے میں اتنی زود رنج بھی نہیں ہوں۔ لیکن میں کسی کی پاؤں کی جوتی بھی تو نہیں ہوں۔ اور پھر تم کیا مجھے اس لیے لے آئے ہو کہ میں تمہارا سوٹ کیس کھولوں، تمہارے لئے رقم اور گلاس لاؤں۔ نہیں پلاؤں۔ تمہارے پیسوں کی حفاظت کروں۔“

”یہ کام بہر حال نہ اتنا دقت طلب ہے نہ ہی اس میں تمہاری کوئی توہین ہوتی ہے۔ کیا برا ہے اگر تمہاری رات کا بڑا حصہ ایسے ہی کاموں میں گزر جائے۔“

”کیوں بھلا۔۔۔ تم مجھ پر کبھی اس قدر ترس کھاتے ہو۔ کبھی مجھے سرے سے عورت ہی نہیں سمجھتے تمہیں تو اس رقم کا حساب چکانا سنانا جو تم نے بے دریغ لگائی ہے۔“

”وہ تو میں چکا ہی لوں گا۔ اپنا اپنا طور طریق ہے۔ اپنا اپنا انداز۔ تم سے تمہارا سراپا لئے بغیر، تمہارا جسم حاصل کیے بغیر بھی تو میں کچھ پاسکتا ہوں۔“

”کیا خاک پاسکتے ہو، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ اور کوشیلیلنے بظاہر بیزاری سے لمبی جماہی لی۔

”پیوگی نا۔“

”ہاں پی لوں گی۔“

”تو پھر میں خود لے آتا ہوں۔ اور ڈیر بالڈ اسٹھ کر کرے کی طرف چلا گیا۔“

کوشیلیا پتھر کی پنچ پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے اسی پنچ کا ایک حصہ ہو۔ ڈیر بالڈ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دم کے پائمنٹ کے ساتھ صرف ایک گلاس تھا اور اس نے دوسرا کوٹ پہن رکھا تھا۔

”دوسرا گلاس مجھے نہیں مل رہا ہے۔ تم اس کوٹ میں پیاری لگ رہی ہو۔ ہم دونوں اسی گلاس میں پی لیں گے۔ رشا نوجہ سو رہا ہے اور بلونت نے بھی اپنے بستر پر لمبی ناناں لی ہے۔“

ایک سانس میں اس نے یہ بے ربط جملے کہہ دیے تو کوشلیا ہنس پڑی۔
”بہت اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہو۔“

”ایسی ادٹ پٹانگ بھی تو نہیں۔۔۔ سارے جملوں میں بس وہی ایک جملہ فٹ نہیں ہوتا ہے جو تمہارے حسن کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ تم شاید یہ چاہتی تھیں کہ میں پانچوں بار یہی جملہ بولتا رہتا۔۔۔ تم اس کوٹ میں پیاری لگ رہی ہو۔ تم اس کوٹ میں بہت پیاری لگ رہی ہو۔۔۔ تم اس کوٹ میں یقیناً بہت پیاری لگ رہی ہو۔۔۔ تم اس کوٹ میں۔۔۔“

”تم کیا مجھ سے کوئی فیصلہ کن لڑائی لڑنے کی ٹھان چکے ہو۔“ کوشلیا نے جھلا کر کہا۔

ڈیر بالڈ ہنس پڑا۔ کوشلیا کے ہونٹوں پر جھکتے ہوئے اس نے کہا۔
”غصے میں تمہارا حسن بہت ٹیکھا ہو جاتا ہے۔“

جب وہ سیدھا ہوا تو کوشلیا نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
”کو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

دیر بالڈ اس سے بالکل ننگ کر بیٹھ گیا۔ اور گلاس میں دم ڈالنے لگا۔

”سوڈا انہیں ملایا؟“ کو شلیا نے پوچھا

”سوڈا انہیں ہے جس قدر گنجائش تھی بوتل میں پانی بھر دیا ہے۔

تم ہلکا سا گھونٹ لو یہ ابھی تلخ ہو گی۔ مجھے معاف کر دو کہ یہاں اس وقت تمہاری چیتھی بیر نہیں پیش کر سکتا۔“

کوئی بات نہیں اس وقت تو میں تمہارے ہاتھ سے زہر بھی پی سکتی ہوں۔

”تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تم نے کسی مسافر سے ایسی بات نہیں کی ہو گی۔“

”قطعاً نہیں کی ہے۔ میرا جسم سب کا سہی۔ میرا دل سب کا نہیں

ہو سکتا۔“

”تو یہ دل اب میرا ہو گیا ہے“

”یہ میں نے کب کہا۔“

پھر تم زہر میرے ہی ہاتھ سے کیوں پیو۔ ہینسن کے ہاتھ سے کیوں

نہ پیو۔ اپنے پیارے لال کے ہاتھ سے کیوں نہ پیو۔ اس سیرا کے ہاتھ سے

کیوں نہ پیو جو تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اس کی پہنچ سے باہر ہو۔“

”لاؤ۔ مجھے پریشان مت کرو۔“ کو شلیا نے اس کا ہاتھ اپنی

گرفت میں لے لیا جس میں ڈیر بالڈ گلاس تھا اے ہوئے تھا — ڈیر بالڈ نے اس کے ہونٹوں سے گلاس لگا دیا تو کوشلیا نے دو تین بڑے بڑے گھونٹ لے لیے اور ڈیر بالڈ نے گلاس اس کے ہونٹوں سے ہٹا لیا ورنہ شاید وہ سارے کا سارا خالی کر دیتی۔

”تلخ ہے نا“ — ڈیر بالڈ نے پوچھا۔

”ہاں بہت تلخ ہے۔ لیکن تم سے کم — اثر بہت اچھا ہے۔ تمہارے اثر کی طرح“

ڈیر بالڈ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”بہت زیادہ گہری ہیں — اس پھیل سے زیادہ جس میں تم بحرہ لے کر دو لٹی رہتی ہو۔“

”ابھی تو تم جھانک رہے ہو — ڈرب کر دیکھو گے تب یہ جیلے کا تمہیں“

”ایک بار ڈرب جاؤں گا تو پھر ابھر سکوں گا؟“

”یہ تم جانو — میں صرف گہرائی سے آگاہ کینے دیتی ہوں۔“

”تو کیا تم ہر مسافر کو اس کی گہرائی سے آگاہ کیا کرتی ہو؟“

”بالکل نہیں — کوئی جھانک کر دیکھنے کی بھی تو زحمت نہیں کرتا۔ بھلا

اُس کو کیا خاک گہرائی سے ڈرائیں گی — وہ تو تم اپنی جان کی بازی لگا رہے ہو سو تمہیں واقف کرادیا۔“ اور نہ بھر پور انگڑائی لے کر ہنس پڑی۔

ڈیر بالڈ نے گلاس خالی کر دیا تو وہ کہنے لگی — "لاؤ — مجھے اور دو — اس کا حلق سے اُترنا ہی مشکل ہے اور جب اُتر جاتی ہے تو آدمی کے پر لگ جاتے ہیں۔"

"اور جب عورت کے پر لگ جاتے ہیں تو؟"

"عورت بہت خطرناک ہو جاتی ہے — یہی کہنا چاہتے تھے نا۔"

"وہ تو تم خود کہہ رہی ہو۔"

"اپنے دل کی بات دوسرے کی زبان سے سن کر تمہیں تسلی ہوئی ہو گی۔"

ہے نا۔ لاؤ مجھے اور تھوڑی سی پلاؤ — تنگ نہ کرو۔"

ڈیر بالڈ نے اُس کو اپنے بہت قریب کھینچ کر کہا — "دھیرج سے — آہستہ آہستہ اس ظالم کے ساتھ چلو۔ — اتنی بکٹ جاؤ گی تو اس خوبصورت سے جسم کا کیا ہو گا — تم کل ہی سے بیڑ چھوڑ کر زم کی ہو رہی ہو — بہت جلد باز ہو — پتہ نہیں اسی جلد بازی میں تم نے کتنوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے"

کو شلیا ڈیر بالڈ کے سینے پر سر تقریباً رکھ چکی تھی — اُس نے سر ہٹا لینا چاہا تو ڈیر بالڈ نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں سے ہتھام کر سینے سے لگایا۔

اُس نے بالڈ کی گردن میں بائیں ڈال کر اپنی طرٹ جھکایا — "تم یقین کر دو میں نے کسی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہر مسافر کے ساتھ قدم قدم ضرور چلتی ہوں — کوئی جی دار ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ سو پچاس قدم چل لیتی ہوں لیکن

پھر ہوتا ہی ہے جو میرا در تجھ جیسی عورتوں کا مقدر ہے۔۔۔ گھنے سائے پل
 بھر میں سمٹ جاتے ہیں۔ چاند کی کرنیں دھوپ پھینکتی ہیں، پھر آگ پھینکتی ہیں اور
 سب کچھ پل بھر میں جھلس جاتا ہے۔ وہی جھیل، وہی قادر آفت زی لیک، وہی
 بجرہ، وہی میں اور وہی شان و جہرہ جاتے ہیں۔ پھر میں ہر آنے والے کو پیسلا
 گلاب دیا کرتی ہوں۔"

"تمتھارے خیال میں تم میرے ساتھ کتنی جھوڑناک آئی ہو؟"
 "میں نے تمھارے ساتھ ابھی تاک قدم بھی نہیں اٹھایا ہے۔ دُوری کا کیا
 سوال — تم اپنے تعلق سے اس قدر رجائی ہوئے ہوئے بھی گنجے ہو۔"

"گنجا ہو کر صرف جی ہی نہیں رہا، میں بلکہ تم سے عشق لڑا رہا ہوں — اور
 یہ رجائیت ہی ہے جو بال جانے کے باوجود آنکھ مارنے سے نہیں چھوکتی —
 درد تم جیسی لڑکیاں جھنجھٹا بنا کر بجائیں اور ہوا میں پھینک کر بھڑول جاتی ہیں"

کو شلیا ہنس پڑی — اُس نے اپنا چہرہ بالڈ کے کوٹ کے اندر
 چھپا لیا اور اپنی ناک سے اُس کے سینے اور پیٹ کے درمیان گدگدانے لگی۔
 ڈیر بالڈ نے مرقع کو غنیمت جان کر شراب گلاس میں اُمٹ لی — لیکن
 آواز سن کر کو شلیا نے کوٹ کے اندر سے چہرہ نکالا۔

"چور کہیں کے — مجھے جُل دیتے ہو؟"

"چور نہیں ہوں — چاہنے والا ہوں — تیز پی بھی ہو۔ چور پیٹ

ہو جاؤ گی میں کہاں لاش کی طرح اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔
 ”پھینک دینا کہیں۔“

”یہی تو ممکن نہیں ہے — در نہ کیا بات تھی — پھینک جاتا۔
 ”اچھا کھوڑی سی پلا دو“ — اور دونوں ہاتھوں سے گلاس مضبوطی
 سے پکڑ کر کوشیا نے ڈیر بالڈ کے ہاتھ اپنی طرف کھینچے جن کی گرفت گلاس پر
 پہلے ہی سے مضبوط تھی اور بہت کوشش کر کے اُس نے دو تین گھونٹ لے لیے۔
 ”تم سچ کس وقت بولتی ہو؟“ — ڈیر بالڈ نے نیچی ہوئی شراب
 پی کر اُس سے پوچھا۔

”اُس وقت جب مرد جھوٹ بولتے ہیں۔“

”اور جب مرد سچ بولتے ہیں؟“

”میں خاموش رہتی ہوں۔ سچائی کی تلاش میں دُور دور تک بھٹکتی ہوں
 اور مایوس لوٹ آتی ہوں۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں — شان و جہ کے باپ کے ساتھ تم کتنی دُور چل کی ہو؟“
 ”میں آج بھی اُس کے ساتھ چل رہی ہوں — سوتے جاگتے کئی کئی بار
 اُس کے ساتھ ہو جاتی ہوں — پھر جھنجھوڑ کر خود کو بیدار کرتی ہوں۔ اور
 بھاگ آتی ہوں اور تم مرد میری اس مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہو — تم لوگ
 جان جاتے ہو کہ مجھ میں جو عورت چھپی ہوئی ہے وہ ابھی پوری طرح بیسوا نہیں

بن سکی ہے۔ میں خوابوں میں چلتی ہوں تو مجھے سکون بھی ملتا ہے اور جب یہ خواب ٹوٹتے ہیں میں تلملا کر ترپ کر بھی رہ جاتی ہوں، سگراف تک نہیں کر سکتی۔ کسی کو کیا بتلا سکوں گی کہ خواب ٹوٹ گیا ہے۔ بھلا کون سمجھے گا اور کسی کو کیس بڑی ہے کہ سمجھے بھی۔

”ممتھارا کوئی خواب ابھی ابھی ٹوٹا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ وہی خواب جو تم نے دکھایا تھا۔۔۔ شانوجہ کو گودیں لے کر۔۔۔ اُسے اپنا کوٹ اڑھا کر۔۔۔ اپنی جیب سے سگریٹ کیس نکلا کر۔۔۔ پھر تم نے اس دنیا کو منٹ بھر میں ریا کر دیا جس کو میں نے عورت، بیوی اور ماں کے سارے جذبوں کا گارا زے کر بنایا تھا اور آپ ہی آپ بسانے لگی تھی۔ لیکن تم یا تو بہت پیارے ہو یا منجھے ہوئے کھلاڑی ہو۔۔۔ برودے کی چڑھائی چڑھتے ہوئے تم ہانپنے لگے، شانوجہ کو اس کے بازو جونا احتیاط سے چمٹائے رکھا۔۔۔ اپنا کوٹ اُس کو برابر اڑھاتے رہے۔ پھر تم نے مجھ سے کہا۔ جیب میں بہت سے پیسے ہیں۔ احتیاط کرنا۔۔۔ مجھے اس طرح ڈانٹا جیسے چوم رہے ہو۔۔۔ اس طرح اپنا کوٹ مجھے پہنایا جیسے اپنا آپا پچھا کر رہے ہو۔۔۔ اور میں نے پھر خوابوں کی دنیا تعمیر کر لی ہے۔۔۔ خوابوں کی اس دنیا میں بھی محبت جھوٹ کے منہ پر تھوک دینے کی حسرت لیے بیٹھی ہے لیکن جھوٹ اتنا خوبصورت ہے، اتنا حسین کہ پہچانا نہیں جاتا۔“

”تم پہچان کر بھی کیا کر دگی؟“

”مجھے کچھ کرنا نہیں ہے۔۔۔ لیکن شانوجہ کو زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں اُس کی خاطر۔۔۔ میرے شانوجہ کی خاطر کوئی میرا ہاتھ پکڑے اور میں اُس کے ساتھ شانوجہ کو لے کر اس ماحول سے بہت دُور نکل جاؤں۔۔۔ اس زندگی سے بہت دُور نکل جاؤں‘ اتنا دُور کہ شانوجہ بڑا ہو جائے تو یہ بات بھی اُسے معلوم نہ ہو کہ اُس کی ماں نے جو کچھ دولت اُس کی تعلیم و تربیت کے لیے جمع کی ہے یہ اس طرح جمع کی گئی ہے جس طرح میں کرتی رہی ہوں۔“

”میرے ساتھ چل سکو گی؟“

”مجھ سے نہیں اپنے آپ سے پوچھو۔۔۔ اپنے دل سے پوچھو کہ وہ مجھے کتنی دُور لے جاسکے گا۔“

”اور اگر میں تم سے کہہ دوں کہ تم سچائی سے بچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتی رہی ہو۔“

”کہہ سکتے ہو۔۔۔ یقیناً اس راستے پر میں اپنی مرضی سے چل پڑی تھی۔۔۔ لیکن اب پاؤں شل ہو گئے ہیں۔۔۔“

”سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم نے یہ راستہ چنا ہی کیوں؟“

”چُنا نہیں ہے۔۔۔ شانوجہ کا باپ مجھے ان راستوں پر بھٹکتا ہوا اچھوڑ گیا ہے۔ بھرے دالا کا کا جانتا ہے، جھیل جانتی ہے۔ چاندنی راتیں جانتی ہیں، وہ بکھر

جانتا ہے، جس بحرے میں شانوجہ کا دل ایک ماں کی کوکھ میں پہلی بار دھڑکا تھا۔
 ”ہینسن بھی جانتا ہوگا۔“

”ہینسن کچھ نہیں جانتا، اُس کا فیوزے بھی نہیں، بروڈے بھی نہیں
 سب ہاں ایک اور چیز جو آج نہیں تو کل جان لے گی اور وہ ہے وہی خوفناک
 کھانی جس میں گلاب پھینک دینے کے لیے میں تم سے التجا بھی نہ کر سکی —
 لیکن اٹھو ڈیر، اب چلو بھی میرے ساتھ۔ ہم اس بلندی ہی سے اپنے گلاب
 کھانی میں پھینک دیتے ہیں۔“

”کیا ہوگا اس سے؟“

”کچھ نہیں ہوگا — لیکن آدمی کو جھوٹی تسلی بھی کہاں ملتی ہے —
 یہ بھی کیا کم ہے کہ تم کھانی میں گلاب پھینکنے کے لیے راضی تو ہو گئے — تم نے
 میرے لیے اتنا تو کیا۔ تم سرابوں کے قائل نہیں ہو — زندگی حق و دق ہو تو
 سراب ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں۔“

”لیکن بلونت کا پھول میں کھائی میں نہیں پھینکوں گا — اُس نے کہا تھا
 کہ پتھر پیاں نوچ کر تمہارے نیچے پکھا دوں۔“

”وہ تم کو لینا — بیچارے پیارے لال کی حسرتیں بھی پوری ہو جائیں۔“

”لیکن میں اپنے اندر بلونت کے پھول میں تمیز کیسے کر سکوں گا۔ — ہو سکتا

ہے کہ میں بلونت کا پھول کھائی میں پھینک دوں اور اپنا پھول نوچ کر تمہارے

نیچے بچھا دوں۔“

پھینکنے وقت ہم دونوں جس پھول کو چھولیں گے ہمارا پھول وہی ہو گا۔
اس کے بعد مجھ میں یہ احساس مکمل ہو جائے گا کہ میں رات بھر کے لیے تمہاری
محبوبہ ہوں، بیوی ہوں۔“

ڈیر بالڈ فہقہ مار کر ہنس پڑا۔

”پگلی کہیں کی۔“ اس نے پیار سے کوش کے گال کو چوم کر کہا۔
”پگلی نہ ہوتی تو اس زندگی سے نباہ کرنا کوئی آسان کام تھا۔“

”تم عورتیں خود اس راستے پر چلتی ہو۔ اشاروں سے مردوں
کو بچاتی ہو۔ ہر وہ چیز حاصل کرتی ہو جو تمہاری مرضی ہے، تمہاری خواہش
ہے یا پھر تمہاری ضرورت ہے اور پھر خود کو مظلوم بنا کر ہم مردوں کے سامنے
پیش کرتی ہو کہ ہم اپنے ظلم کا تماشہ دیکھیں اور تہمت اپنے سر اڑھ لیں۔“
”تم اس طرح دل شکنی پر کیوں اتر آئے ہو۔“ اس خرم چاہنے کیا ہو۔
”کوشلیانے بگڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈیر بالڈ نے اُس کو کھینچ کر سینے سے لگایا۔ ”تمہیں خفا کرنا چاہتا
ہوں۔ غصے میں تمہارا پھرا ہوا حسن دیکھنا چاہتا ہوں اور اسی عالم میں تمہیں
جو منا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تم کوئی ایسی ناقابلِ تسخیر چیز بن
جاؤ جسے حاصل کرنے کے لیے مجھے طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑے۔ ہوشیاری

اور مکاری دکھانی پڑے — اُس وقت جب تم غیض و غضب کے عالم میں اپنے نازک ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ کر اُس کی دھجیاں کرنا چاہو، میں تمہارے کپڑے اُتارنے کی کوشش کروں۔
 ”یہ کیسی خواہش ہے؟“

”پتہ نہیں۔ میں خود نہیں جانتا کہ یہ کیسی خواہش ہے۔ یہ شاید کسی ایسے مرد کی خواہش ہے جو پیسے کے بل بوتے پر تمہیں اور تمہاری بہنوں کو حاصل کرتا رہا ہے۔ وہ چیز جو حاصل ہوتی رہے پھر اُس میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔“

”تم بیک وقت کتنے نرم اور کتنے سخت ہو۔“
 ”میری بیوی بھی یہی کہتی ہے۔ لیکن تمہارے قبیل کی عورتیں مجھے ظالم سمجھتی ہیں اور دوسروں کی بیویاں مجھے نیک اور نرم۔“
 ”یکایک وہ اچھل کر ڈیر بالڈ کی آغوش سے جدا ہوئی اور تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی، وحشیانہ آنکھوں سے اُس نے ڈیر بالڈ کو دیکھا اور قریب قریب چلا کر کہا۔“

”سنو۔ سنو۔ وہ شانوجہ کی آواز ہے۔ یقیناً یہ میرا شانوجہ ہے۔ میں نے اُس کی یہ آواز پہلے بھی سنی ہے۔“ اور وہ ایک لمحہ انتظار کیے بغیر دیوار دار گمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ اُس کے پیر اُس کے ڈھلکے ہوئے

اُس اُلجھ گئے۔ اُس کی لمبی لمبی ناگنوں کی طرح لہرائی زلفیں بلی
رکھیتی رہیں۔ پھر کچھ سنبھل کر وہ اور بھی تیز دوڑنے لگی۔
یر بالڈ حیران تھا۔

عہ بھر کو اُس نے سوچا کوشلیا کوئی نیم پاگل لڑکی تو نہیں ہے اور
میدت میں تو نہیں گرفتار ہو رہا ہے؟
لیکن لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بلکہ قریب قریب دوڑتا ہوا جب وہ کوشلیا
ب پہنچا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے پر جو اندر سے بند تھا ٹکرا رہی
پہلے اُس نے دروازہ خوب پٹا پھر اُس بائیں اور سیدھے بازو پر
جھٹکے کر خود کو دروازے سے ٹکرایا۔ چٹخنی کسی خرابی کی وجہ سے
رکھل گئی۔ دروازے کے پٹ اُس وقت آواز دے کر کھلے جب
ری قوت سے دروازے سے ٹکرائی تھی۔ کوشلیا کمرے میں

شانوہ کا نیکر بھی نیچے پڑا ہوا تھا اور وہ پیارے نال کے بستر پر نسکا پڑا
رہا تھا۔

کوشلیا کی آنکھوں میں زمانے بھر کی وحشت جیسے پناہ لینے کے لیے چلی
ہیں۔ اُس کی آنکھیں گھاسل ہرنی کی طرح وحشیانہ تھیں۔ اُس نے پھیلی
آنکھوں سے بلونت کو دیکھا جو جلدی جلدی پتلون پہن رہا تھا۔ وہ سخت

لگا کر اٹھی اور بلونت پر جھپٹی۔ اُس نے تاڑ توڑ دو چار مکے اور تھپڑ بھی اُسے
جڑ دیے۔

ڈیر بالڈ نے بیچ بچاؤ کیا — وہ کوشلیا کو اپنی بانہوں میں کس لیتا اور وہ
پھر بھر کر نکل جاتی — آخر سن ڈیر بالڈ نے بلونت کو کمرے کے باہر ڈھکیل
دیا اور دروازہ بند کر کے کوشلیا کے کپڑے اُتارنے کی کوشش کرنے لگا جس
سے کوشلیا غصہ کے عالم میں بے خبر تھی۔

افواہیں گرم تھیں کہ شانوجہ برہن بستی ہی کے کسی گھر میں چھپا ہوا ہے۔ فیوز
ہینسن کے ملازم یعنی فیوزے کے اُس بیرے نے جو کوشلیا کو حسرت سے آج
بھی تکا کرتا ہے یہ بتلایا کہ خانوں کی ٹولی کے اتنی سالہ صدر کے چالیس سالہ سب
سے چھوٹے بیٹے نے شانوجہ کو رکھ لیا ہے جس کا شہر میں گتہ داری کا دھندا ہے۔
کوشلیا کی ہمدردی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فیوزے کا یہ براہینسن
دوروز کی چھٹی لے کر برہن بستی کو جا رہا تھا۔ اُس نے ہینسن کو چھٹی لینے کی
وجہ بھی نہیں بتلائی تھی۔ لمبی مدت کے لیے چھٹی لے کر وہ بیوی بچوں میں کچھ ہی دن
پہلے ہوا آیا تھا اس لیے اُسید نہ تھی کہ ہینسن بغیر تنخواہ وضع کیے مزید دوروز کی
اُس کو چھوڑ دے گا، اُس نے ابھی خاصی اداکاری کی — اُس نے شہر سے

انے کا انتظام کر لیا۔ تار آیا تو وہ فیوزے ہی میں کاؤنٹر پر سینسن کے سامنے
ٹائی سینسن ہی نے تار وصول کیا اور اُس کی طرف بڑھایا تو بہت فکر مند
س نے کہا کہ آپ ہی پڑھ دیجئے — لکھا تھا۔

”ماں مر گئی ہے — فوراً چلے آؤ۔“

ہینسن نے کچھ سوچ کر کہا۔

”تمہاری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ بچنے کی اُمید کم ہے تمہیں
ہے۔“

صمصام دین جو فیوزے کے گاہکوں کے لیے صرت بیرا تھا اور ہینسن کے
اُس کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑا رہا پھر دو آنسو اُس کے گالوں تک
پھر اُن کے پیچھے اور آنسو ڈھلک آنے میں کامیاب ہوئے اور پھر وہ
وہ رونے لگا۔ گاہکوں میں سے ایک نے جو قریب ہی کی میز پر بیٹھا ٹوٹتے
سے دانتوں میں پھنسا ہوا گوشت نکال رہا تھا ہاتھ کے اشارے سے ہینسن
برا کے رونے کی وجہ پوچھی۔

”سیم سن کی ماں مر گئی ہے مجاری۔“

صمصام دین چونکا۔ ”مر گئی ہے؟ — سچ بتاؤ زندہ ہے یا مر گئی؟
ابھی تو آپ نے بتایا تھا کہ اُس کی حالت بہت خراب ہے — تار میں
ماہ ہے؟ — کیا لکھا ہے تار میں۔“ اور صمصام دین اسی جگہ

پھوٹ کر رونے لگا۔

”صبر کرو سمن، صبر کرو — اور جاؤ پہلی بس پکڑ لو۔“

سمن نے اُس کے کندھے کو دبا کر کہا اور گاؤں کی ڈرائیو کھول کر دس روٹ کے دنوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے — کہنے لگا۔

”رکھ لو — کام آئیں گے — میں ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ کاٹ لیا کروں گا۔“

”شکریہ سر۔“ مصمصام دین نے اپنی آنکھوں کی چمک کو چھپاتے ہوئے کہا جو دنوٹ دیکھ کر بھٹکے ہوئے جگنو کی طرح اُس کی آنکھوں میں چلی آئی تھی — اُس نے بے دلی سے نوٹ پتلون کی پچلی جیب میں رکھ لیے۔

جب دنوٹ چھیل کے کنارے، پیوس کے جھونپڑے میں کوٹلیا سے ملنے کو آیا تھا تو اُس کو دُور سے آتا ہوا دیکھ کر ہی اُس کے استقبال کے لیے کوٹلیا باہر نکل آئی تھی۔

مصمصام دین بہت ہمدرد آدمی ہے — کوٹلیا اور کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی اور وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے بلکہ دل ہی دل میں مجھے چاہتا ہے — غریب ہے اور خالی جیب لے کر چونکہ مجھ تک پہنچ نہیں سکتا، میرے دکھ درد میں حصہ بٹاتا ہے تاکہ محبت اور ہمدردی دے کر مجھے اپنی طرف ملتفت کر سکے اور میں اُس کی اس کمزوری اور ناداری سے پُوری طرح لطف اُٹھا رہی ہوں۔

اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور جھونپڑے سے باہر نکل آئی۔ صمصام دین قریب پہنچ گیا تو وہ سُکرانے لگی اور یہ جھول گئی کہ اُس نے ابھی ابھی ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

”چھٹی مل گئی صمصام!“ کو شلیا نے بڑے پیار سے پوچھا۔
 ”ہاں مل گئی ہے۔“ صمصام نے جو کچھ دیر پہلے فیوزے ہاندکے کانٹر پر کھڑا سکیاں لے رہا تھا، بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

”بھلا مینس کیسے راضی ہو گیا صم؟“

صمصام دین کو شلیا کی چھاتیوں کو تنگ رہا تھا جو گرتے اور محرم میں چھپی ہوئی تھیں لیکن جن پر آنچل پڑا ہوا نہ تھا۔

اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کو شلیا نے شریہ نظروں سے صمصام دین کو دیکھا۔ صمصام دین ہوش میں آیا اور شریہ کو نظریں جھکالیں تو کو شلیا نے پھر پوچھا۔

”بھلا مینس کیسے راضی ہو گیا صم؟“

صم۔ صم۔ صم۔ اس مختصر نام میں کتنی دلکشی ہے۔ کو شلیا نے پہلے بھی صم ہی کہا تھا لیکن صمصام دین وہ چیزیں دیکھ رہا تھا جو اب کو شلیا کے دونوں ہاتھوں کی صلیب کے نیچے چھپی ہوئی تھیں اور اس چاہت سے بکا رہے جانے کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ اب اُس کو کو شلیا کی زبان سے صم بہت پیارا

لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی اُس کو پکارے۔ کوش۔ جیسے بہت سارے
 گاہک فیوزے میں اُس کے ساتھ پی کر اُس کو پکارتے رہے ہیں اور مصمصام دین کھڑا
 پلٹ پلٹ کر ہمیشہ دیکھتا رہا ہے کہ روپیہ کوشلیا کو منٹ بھر میں کس طرح کوش بنا کر
 رکھ دیتا ہے۔

”تم کہاں ہو۔ سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟“
 مصمصام دین اس طرح چونکا جیسے بڑی رات کو فیوزے میں اُذنگھتے وقت
 گاہکوں کی گھنٹی کے تسلس پر چونک پڑتا ہے۔ از روہ بچوں کی طرح باہیں
 کھولی کر سننے لگا۔

”کچھ بتاؤ بھی صم۔“
 صم۔ صم۔ صم۔ اس صم نے تو مصمصام دین کو کہیں کانہ رکھا تھا۔ لیکن
 اب کی بار اُس نے اپنے اوپر قابو رکھا۔
 ”میں نے شہر کے ایک دوست کو چٹھی لکھی تھی کہ وہ تار کے ذریعہ میری ماں
 کے مرنے کی اطلاع دے، سو اُس نے دے دی۔“
 ”ہائے اللہ۔ ماں سننے گی تو کیا کہے گی صم۔“

پھر صم۔
 مصمصام دین کوشلیا کو اس طرح تکنے لگا جیسے بچہ دکان میں دھرے پڑے
 کھلونے کو تکتا ہے۔

”ماں تو اُسی دقت مر گئی تھی جب میں پیدا ہوا تھا۔“ صمصام دین نے انکشات کیا۔ پھر میں ماں کو کئی بار جلا کر اڑتا رہا ہوں۔ اسکول میں بھی میں نے کئی بار اُس کو مار دیا تھا۔ لیکن وہ میری مدد کرنے کو پھر زندہ ہو گئی تو آج ماں دیا۔“

کوشلیا کو یوں لگا جیسے سب بچے ماؤں کو اسی طرح مارتے ہیں اور شانوجہ تو اُس کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے ذریعے ہے۔

”خرچ کے لیے یہ رکھو۔“ بند بٹھی صمصام دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کوشلیا نے کہا تھا۔

”میرے شانوجہ کو کسی طرح بے کراؤ دم۔ میں تمہارا احسان نہیں بھولوں گی!“

لیکن صمصام دین نے اپنا ہاتھ بڑھا کر کوشلیا کا ہاتھ روک دیا اور کہا۔

”پیسے میرے پاس ہیں اور میں یہ سب کچھ پیسوں کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔!“

”میں جانتی ہوں۔ سب کچھ جانتی ہوں۔“

صمصام دین کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ ”تم جانتی ہو۔“ تم سب کچھ جانتی ہو۔ کیا جانتی ہو تم؟۔ اور وہ شانوجہ کی

تلاش میں برہن بستی کے لیے روانہ ہو گیا۔ تب بھی ہر ہر قدم پر اُس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں صم۔“

اور دو روز کے بعد آج جب وہ واپس آیا تھا تو اُس نے بڑے ہی رازدارانہ طور پر کوشلیا کو بتلایا تھا کہ شانوجہ کو انٹی ساتھ خانوں کے صدر کے چالیس سالہ بیٹے نے رکھ لیا ہے اور شانوجہ اب زمانے کیڑے پہنتا ہے، ساری باندھتا ہے اور چوڑیاں بھی اُس نے پہن رکھی ہیں۔ وہ لب اسٹک بھی لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ — یہاں تک کہ — سینے پر کچھ اُبھار سا پیدا کر کے اُس نے — اُس نے پستان بھی بنا لیے ہیں۔“

آخری حمد جلدی سے کہہ چکا تو صمصام دین پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ایک تو کوشلیا کا قرب — اتنا قرب کہ وہ اُس سے بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا، اتنا آہستہ کہ سوائے کوشلیا کے کوئی نہیں سن سکتا تھا اور پھر باتیں بھی ایسی کہ — لیکن صمصام دین نے جب کوشلیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اُس کی آنکھوں سے جھڑی ٹکی ہوئی تھی۔ صمصام کبھی خاموش رہا اور دیر تک زمین پر انگلی سے آڑی تزی بھی لکیریں کھینچتا رہا۔

کوشلیا نے جب خود کو کچھ سنبھالا تو اُس نے صمصام سے دریافت کیا کہ

آیادہ شانوجہ سے مل سکا ہے۔

صمصام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ شانوجہ سے ملنا بہت مشکل ہے۔ مگر پر جو نوکر چاکر ہیں اُن میں سے بہت سوں کو ابھی اس کا علم بھی نہیں ہے کہ شانوجہ کوئی لڑکا ہے۔ وہ تو صرف اس حد تک جانتے ہیں کہ خان ایک پٹھیا اٹھالایا ہے جو اس کے چند روزہ کے لیے تفریح کا یہاں آئی ہے اور پھر شہر چلی جائے گی۔ اور وہ کوئی بھی ہو۔ ہر حال ان کی مالکین ہے اور سب کے سب اس نئی مالکین کے اشارے پر دوڑتے ہیں۔

کچھ رُک کر وہ پھر کہنے لگا۔ "میں صرف ایک بار شانوجہ کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ اُس نے مجھ کو دیکھا نہیں اور میں دیکھ کر بھی اُس کو پہچان نہ سکا۔" پھر سے دار نے مجھ کو چھپایا تھا کیونکہ رات ہوئی میں بہت سا پیسہ میں نے اُس پر خرچ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے صرف اتنا کہا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو آج کل مالک کی منظوری نظر ہے۔ اشاروں سے اٹھاتی اور بٹھاتی ہے اور مالک اُس کو خوش کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ چھوٹا خان، سرخ و سفید محیم شمیم آدمی ہے۔ شانوں تک بال ہیں جو بہت سلیقے سے کٹے ہوئے ہیں۔ شانوجہ اُس کے پہلو میں بہت قریب ہو کر موڑ میں بیٹھ گیا تھا اور وہ بڑی محبت سے اُس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس کو

پھر دیکھنے کی کوشش کی کہ پہچان سکوں۔ ایک جھپک پھر اُس وقت دیکھی
جب موٹر روانہ ہوا لیکن میں اُسے پہچان نہ سکا۔ اُس کے پاس وہ سب
کچھ تھا جو ایک نوجوان لڑکی کی پہچان ہے۔ لیکن اس کے بازو مجھے
یقین ہے کہ وہ شانوجہ ہے اس لیے کہ میرا درست مجھے غلط اطلاع نہیں
دے سکتا۔

اس تفصیل کو پولیس کے حوالے کرنے میں کوشش کو پس و پیش تھا۔ وہ
جانتی تھی کہ پھر یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہے گی اور دنیا جان لے گی
کہ شانوجہ اس حد تک خراب ہو چکا ہے ہینسن تو طعنوں اور کچوکوں سے
میرا کلیجہ چھلنی کر دے گا۔ پہلے ہی شانوجہ نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے جو
اب دوسرے لوگ پوری کریں۔ وہ سسک سسک کر رہ جاتی اور شام
ہوتے ہوتے اُس کی اُداسیاں ہی اُس کے چہرے کا غازہ بن جاتیں اور جھیل
پڑ بھرے میں سیر کرنے والوں کی پذیرائی کے لیے تیار ہونے سے وہ گریز کرتی
اس کے بازو بھی کہ کا کا اصرار کرتا رہتا۔

شانوجہ سے اُس کو جُدا ہوئے چھ دن ہو چکے تھے۔ وہ اس کو
دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔ تنہا بیٹھے بیٹھے بسا اوقات اُس نے شانوجہ کے
خلاف بھی سوچا تھا۔ کئی بار اُس نے ارادہ بھی کیا تھا کہ وہ شانوجہ سے اب
بالکل بے تعلق ہو جائے گی۔ ایسی اولاد کی زندگی اور موت میں کی

ہے — وہ خود چلا آئے بھی تو وہ ملے گی بھی نہیں — اچھی ازلا د
 دن سے ہوتی ہے۔ شانوجہ کیسی بھرپور جوانی نکال رہا تھا۔ مردوں
 ح اُس کے اطوار خراب بھی، موٹے تو وہ سہہ لیتی لیکن شانوجہ نے تو
 نہیں کانہ رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی ناامید نہیں ہوئی تھی
 تھی تھی کہ شانوجہ عمر کی ایک منزل میں پہنچ کر سنبھل جائے گا۔ جب
 بٹ پھاٹ کر جوان ہو گا تو وہ اُس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر بلک
 روئے گی — ”تم میرے بڑھاپے کا سہارا ہو شانو۔ تم میرے سفید بالوں
 رو ہو — لیکن شانوجہ تو ساری پہنتا ہے — اپ اسٹک لگاتا ہے۔
 کلائیوں میں چوڑیاں چھین چھنتی ہیں — اُس کا سینہ جس پر سر رکھ کر
 نے کی حسرت ہے اُس پر شانوجہ نے مصنوعی گولیاں سجا رکھی ہیں — اب
 سر کہاں لے جاؤں جو میرے دوش پر بار ہو گیا ہے — بھگوان جو کچھ میں
 نا ہے سب جھوٹ ہو — یہ سب غلط ہو۔“

اُس نے مری ہوئی آواز میں کہا —

”وہ شانوجہ ہوتا تو تم ضرور پہچان لیتے صم۔ — وہ میرا شانوجہ نہیں
 نہیں ہو گا وہ میرا شانوجہ۔“

”میں اُس کا پتہ لگاؤں گا کوش۔“

بجرے والے بوڑھے کا کانے کو شلیا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے تسلی دی۔

— تم روزِ دروگر ہلکان نہ ہونا — تم نے شانِ نوجہ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا
— وہ ابھی نازان ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو بھی غنیمت
جائے اور وہ لوٹ آئے گا مجھے یقین ہے۔ مجھے دسواں ہے کوش — جھیل
پر ڈولتے ہوئے بھرے کی قسم میں اُسے لے آؤں گا۔

صمصام بیٹا اس راز کو اپنے سینے میں پھپھار کھنا۔

صمصام نے بیوقوفوں کی طرح کا کا کے پہرے کو تھکتے ہوئے سر ہلایا۔
کو شلیا نے آنکھوں سے آنکھیں خشک کر کے فطریں اٹھائیں تو جھیل کے
سینے پر ڈولتے ہوئے کنول اُس کو اپنے ہی آنسو سے دیکھنے لگا۔

آج شانِ نوجہ کے لیے روتے ہوئے جانے اپنے آنسوؤں کی نسبت اپنا
پاکیزہ تصور اُس کے ذہن میں کس طرح ابھر سکا وہ اُس نے کبھی بھی اپنے
آنسوؤں کو اہمیت نہیں دی تھی۔

ہاں تیرے آنسو دلدل میں گرتے ہیں تو بھی کنول بن جاتے ہیں —
اُس نے خود ہی سوچا۔

کو شلیا چاہتی ہے کہ وہ اتوا ہیں جو شانِ نوجہ کی نسبت جھیل، فیروزے
اور بردوئے گیسٹ ہاؤس کے مثلث میں پھیلی ہوئی ہیں وہ سب کی سب
غلط ثابت ہوں۔ فیروزک سینک کو وہ ان اتواہوں کے پھیلانے کا ذمہ دار
گردانتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شانِ نوجہ کی تباہی اور بربادی کی

داستانیں ہینسن تک سرچ لگا کر جانے پہچانے لوگوں میں بیان کرتا ہے۔ وہ
 انہیں یقین دلاتا ہے کہ صرف کوشلیا کی وجہ سے شانوجہ ان راستوں پر
 چل پڑا ہے جو لڑکوں کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتے۔ وہ کہتا ہے کہ کل
 شانوجہ کوشلیا کی آمدنی میں اضافے کا باعث بن جائے گا اور آج جو باتیں
 ڈھکے چھپے ہو رہی ہیں کلی کھلے بندوں ہوں گی۔ لونڈے کے کمانے کے یہی
 دن ہیں اور لونڈا ہے بھی ظالم۔ ہینسن نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ شانوجہ
 کہاں ہے، کوشلیا سب کچھ جانتی ہے۔ کسی موٹے آسامی نے شانوجہ کو رکھ
 لیا ہے۔ کوشلیا نے یقیناً معقول معاوضہ لیا ہوگا۔ ماں ہو تو ایسی ہو،
 وہ بلا تکلف اور بلا کسی جھجک کے پورے یقین کے ساتھ کہتا۔ ماں ہو
 تو ایسی ہو کہ تو مہینے جس اولاد کو اپنے پیٹ میں رکھا تھا اس کی نسبت عایش
 مانگتی رہی کہ خوبصورت سی بچی ہو تاکہ اس کے پیشے کو آگے بڑھا سکے۔ لیکن
 جب بچہ ہوا تو دھن کی بچی کوشلیا نے اس کو بھی اسی ڈگر پر ڈال دیا۔

ہینسن کی باتیں سوچ سوچ کر کوشلیا کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ وہ چاہتی
 تھی کہ شانوجہ پر دان چڑھے۔ اچھا سانوجوان نکلے جس پر وہ فخر کر سکے۔
 کوشلیا کی اس تمنّا کے پیچھے اتنا بھی تھی اور فیوزک ہینسن کو دنیا کے سامنے
 دروغ گو ٹھہرانے کا جذبہ بھی۔ فیوزک ہینسن کوشلیا کے لیے ایک مستقل
 آزار بن گیا تھا۔ وہ شانوجہ کا قصور کرتی تو فیوزک ہینسن کا چہرہ بھی ساتھ

اُس کے ذہن میں اُبھرتا ہے — وہ دل تھام کر رہ جاتی — شانوجہ تم اچھے بن جاؤ۔ تم ایسے بن جاؤ شانوجہ کہ میں سینہ تان کر فیوزک سمین سے کہہ سکوں کہ دیکھو یہ میرا بیٹا ہے — اس کی کڑیل جوانی دیکھو۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ دیکھو۔ اس کے بازوؤں کا بل دیکھو اور میرے خلاف دنیا بھر میں بک کرنا چھوڑ دو۔ لیکن شانوجہ سنا ہے کہ تم نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لی ہیں — سینے پر ایسی گولیاں اُبھار لی ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی ماں رو بھی نہیں سکتی — کاش تو پیدا نہ ہوتا شانو — یا پھر مرجاتا — مرجاتا — مرجاتا — مرجاتا اور کوشلیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسرے دن کا کاروانہ ہونے لگا تو رہن بستی میں خان کے گھر کا پتہ صمصام دین نے اُس کو اچھی طرح سمجھا دیا۔ جاتے جاتے صمصام دین سے کا کا نے کہا کہ اُس کے لٹٹنے تک نہ کوشلیا کا ذرا خیال رکھے — ہفتے کو بہر حال لوٹ آؤں گا — وہ کہنے لگا کیونکہ اتوار کی صبح سے ہی بحرے کے شوقین مسافروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھوس کے جھو پڑے کی چھت پر اُس نے ٹین کا بورڈنگ لاجس پر لکھا تھا۔

”بجرہ مرست طلب ہے۔“

اور نسبتاً بار یک خط میں نیچے لکھا تھا :

”ہم کل آپ کے منتظر رہیں گے۔“

جھاڑ پونچھ کر اُس نے اس بورڈ کو لوہے کی اُس صلیب پر اسکرز سے فٹ کیا جو جھیل کے چمن کے چھوٹے سے گیٹ کے برابر بنی کھڑی تھی۔ پھر وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا جھوپڑے میں چلا گیا۔

کھاٹ کے نیچے سے اُس نے ایک اور تختی نکالی اور پاس پڑے ہوئے میلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اُس کو صاف کیا۔ حروف واضح ہو گئے تھے۔ لکھا تھا :-

”آج چمن میں داخلہ ممنوع ہے“۔ اُس نے اس تختی کو صمصام دین کے حوالے کر کے کہا کہ چمن کے گیٹ پر کسی تسلی یا تار سے باندھ دے۔

کا کا روانہ ہوا تو کوشلیا نے محسوس کیا جیسے جھیل کا پانی بھرے سے سرنگار رہ رہا ہے حالانکہ ہر چیز بدستور جوں کی توں تھی۔ جھیل اپنی گہرائیوں کو سمیٹے بالکل خاموش تھی اور اُس کے سینے پر ڈولنے والا بجرا یوں ٹھہرا ہوا تھا جیسے جھیل کا پانی برت بن گیا ہو۔ کوشلیا کی آنکھوں میں بھی آنسو کی ایک بند نہیں تھی۔ واقعی کوئی چیز زبردستی تھی تو نہ شاید کوشلیا کا دل تھا جس کا پر تو وہ سارے ماحول میں دیکھ رہی تھی۔ پیلے گلاب اپنی شاخوں پر بھوم رہے تھے اور اُن کی پنکھڑیوں پر چمکنے والے اداس کے موتی سورج کی کرنوں نے ایک ایک کر کے پی لیے تھے۔ دُور دھوپ پھیل گئی تھی اور پہاڑی کے دُعا سے چرواہے کی بانسری کی صدا ہوا کے دوش پر سوار ہو کر ”داخلہ ممنوع ہے“

کی تختی کی پردا کیے بغیر چمن میں آ رہی تھی اندر پرسکون جھیل کے سینے پر تیر کر
 لہروں میں تبدیل ہو رہی تھی — روتے رہنے سے کوشلیا کی آنکھیں سُرخ ہو گئی
 تھیں اور پوٹے سوج گئے تھے لیکن اُس کی صباحت اور ملاحیت کچھ اور ٹھیک
 آئی تھی — تین روز سے اُس نے نہ شام کو سٹھکار کیا تھا، نہ فجر پر اُٹنے
 والے مسافروں اور لورسٹوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے مسکراتے ہوئے گلاب
 کے تختوں تک گئی تھی — آنے والے مسافروں میں کسی جان پہچان والے
 نے کوشلیا کو پوچھا بھی تو کا کانے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ ان دنوں یہاں
 نہیں ہے، بس کل پرسوں میں آجائے گی۔

آج جب کا کا خود جا رہا تھا تو وہ سوچ رہی تھی کہ آنے والے مسافروں کی
 یورش سے بچنے کے لیے گیٹ پر تالا ڈال دینا چاہیے — تاہم پرکھیلی ہوئی
 لال لال پھولوں کی ہری ہری باڑہ کے احاطے کے نیچوں بیچ لوہے کی سلاخوں
 کے تین فیٹ اوپنچے جھوٹے سے گیٹ پر کوشلیا نے اندر ہی کھڑے کھڑے
 ہاتھ بڑھا کر تالا ڈال لیا اور موٹر پر نظروں سے اوجھل ہونے تک کا کا اور
 عمصام دین کو دیکھتی رہی — عمصام دین کچھ اور دُور چل کر اس موٹر پر
 کا کا سے جدا ہو گیا جو فیروز سے لیک ل کی طرف تھا۔

تنہائی کا اتنا شدید احساس آج تک کوشلیا کو نہیں ہوا تھا۔ پہلے پہلے
 کھلے ہوئے گلاب اور کھلی ہوئی کلیاں جو اُس کی رُوح کو فرحت بخشی تھیں

آج وہ بھی اُس کی اُداسی کو ہوا دے رہی تھیں۔ بحرے کے قریب تازوں کا جوڑا چہل کرنے اور غوطے لگا لگا کر نہانے میں مگن تھا۔ اور پرمنڈلاتی ہندی چیل کو دیکھ کر کا کا کے مرغ "شیردل" نے عجیب سی آواز بھی اُبھی گلے سے نکالی تھی جو اس خطرے کی گھنٹی تھی کہ چیل اُد پرمنڈلار ہی ہے۔ شیردل کی آواز سن کر بھک سفید "مکھنیا" بے تاب ہو اُٹھی تھی اور ننھے ننھے چوڑے رونی کے گالوں کی طرح لڑھک کر اُس کے پیروں میں سمٹ آئے تھے اور "مکھنیا" سب کو سمیٹے زمین سے جیسے گوند لگا کر چپک گئی تھی۔ شیردل گردن گھما گھما کر خطرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس بار کو شلیا کو شانوجہ اندر اُس کا باپ دونوں ہی بے اختیار یاد آئے۔ وہ سوچنے لگی کہ باپ کا سایہ بچوں کے لیے کس حد تک ضروری ہوتا ہے لیکن جیسے مکھنیا نے اُس سے کہا کہ ماں کی آغوش اُس سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ دیکھو نا۔ دیکھو میں نے کیسے سب کو پروں میں چھپا کر رکھا۔ کو شلیا نے اس کے بعد سپر ڈال دی۔ وہ شانوجہ کے بے وفا باپ پر شانوجہ کی تباہی کی ساری ذمہ داری سوپ کر خود کو جھوٹی تسلی دینے کے درپے تھی کہ تو بے تصور ہے۔ کو شلیا تو مظلوم ہے۔ بے سہارا ہے۔ لیکن اس خود غریبی کو جب وہ تادیر قائم نہ رکھ تو خیوڑک ہنسن جیسے اُس پاس سے اس کے کانوں میں چلنے لگا۔ "تم ہو۔ شانوجہ کی تباہی کا

کا باعث تم ہو کوش۔“

شانوہ پہلی بار جس حادثے سے دوچار ہوا تھا وہ اُسی کٹیا میں تو ہوا تھا۔ تم اور تمہارا کا کا بجرے میں مسافروں کو سیر کرانے میں مگن تھے۔ تم نے نہیں سوچا ہو گا کہ انسان درندہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تم نے بہر حال یہ تو سوچا ہوتا کہ شانوہ کٹیا میں اکیلا ہے۔ اُس کا بچپن کٹیا میں اکیلا ہے، اُس کی معصومیت کٹیا میں اکیلی ہے جس کو تمہاری ماتا کی ضرورت ہے لیکن تمہاری ماتا تو اس مرد کے قدموں میں پڑی بلک رہی ہے جس نے تمہیں کنواری لڑکی سے عورت بنایا۔ تمہاری گود شانوہ سے بھری اور پھر ایسے ہی کسی مرد نے شانوہ کے معصوم بچپن کو اپنی جنسی ہوسناک درندگی سے شکار کر کے ایسے ہی کنویں میں پھینک دیا کہ آج اُس کی آواز کے لیے ترس رہی ہو۔

شانوہ کا باپ مجرم ہے کو شلیا۔

لیکن تم اُس سے بڑی مجرم ہو۔ تم راستے کے کانٹوں کو بھول کر اپنے ڈیر بالڈ کے لیے برودے گسٹ ہائڈس کی پتھریلی بیج پر پھولوں کی جو سیج بچھا رہی تھیں اُس سیج نے تم سے تمہاری ماتا چھین لی تھی۔ تم شانوہ کو پیارے لال کے ساتھ کمرے میں اکیلا چھوڑ کر بھول گئی تھیں۔ اور یہ کہ تمہیں شانوہ پر گزرا ہوا کٹیا کا وہ اولین حادثہ بھی یاد نہ آیا جس

نے ہتھارے ذہن کو اتنے جھٹکے دیے تھے کہ تم پاگل ہو سکتی تھیں۔ شانوجہ کے پیار نے ہی تمہیں متوازن بنایا اور تم نے بڑی ہمت سے اُس کی دیکھ بھال کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن اُس وقت جب تم ڈیر بالڈ کے سہارے اپنی گریہست زندگی کی تنداؤں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اتنا دُور نکل گئی تھیں کہ شانوجہ کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی بھی تم نے زحمت نہیں کی۔ حالانکہ ان خواہشوں اور ان تنداؤں کے پیچھے تم ہی نے بتایا تھا کہ شانوجہ کا مستقبل چھپا ہے، لیکن۔۔۔ لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔۔۔ تم اُس وقت ایک ایسی لٹی ہوئی عورت تھیں جو بازار میں لائے جانے کے بعد بھی یہ سوچتی ہے کہ کوئی خریدار اُسے گھر کی زینت بنائے گا۔ لیکن تم ایک ایسے خریدار کے ہاتھوں بکیں جس نے تمہیں پھر بازار ہی میں سجا دیا اور ماں بننے کے باوجود تم اپنے اس وجود کی تکمیل نہ کر سکیں جسے ایک چھوٹا سا گھر چاہیے تھا بچوں کی ایک قطار چاہیے تھی اور ہتھارا شام کو گھر لوٹنے والا شہر۔۔۔

سوچو کوشلیا، جھیل، فیوزے اور رودے گسٹ ہاؤس کے اس مثلث میں تم اپنے کتنے ہی چاہنے والوں کے ساتھ، اُن کی ہمدردیوں کے سہارے قدم لا کر چل پڑی ہو اُس عورت کو اپنے وجود میں چھپائے ہوئے جو کسی چاہنے والے بچوں کی ماں ہو کر رہنا چاہتی ہے۔

تم نے یہ تک نہ سوچا کہ ہتھاری زندگی میں داخل ہونے والے کتنے ایسے

لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے اپنی ہینے بھر کی کماٹی ایک ہی رات میں تم پر صرف کر دی ہوگی اور تمہارے آگے اس طرح سینہ تانا ہو گا کہ اُن کا روزانہ کا خرچ یہی ہے۔ کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے باپ کی جائیداد بیچ دی ہوگی یا بھائی کا حصہ غصب کر لیا ہو گا۔ یا بیوی کے زیور رہن رکھ دیے ہوں گے یا جوہری کی ہوگی۔ لیکن تم آنکھیں بند کیے ہر ظاہری چمک کے پیچھے بھاگتی رہیں۔ جھیل، فیوزے اور برزدے گسٹ ہاؤس کے اسی مثلث میں کہیں مصمصام دین بھی تو تمہارا منتظر رہا ہے۔ کتنی ہی مدت تک اُس نے شادی نہیں کی شاید تم اُس کا ہاتھ تھام لو لیکن تم نے ان اندھیروں کے بادلوں جن میں شانوجہ کے باپ نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر کے ڈھکیں دیا تھا کسی جگنو کی چمک نہیں دیکھی۔ تم جگنو کی چمک سے راستہ متعین کرنے کا کام لینے کی اہل ہی نہیں رہی تھیں۔ تم تو پھر روشنیوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں جو آنکھوں کو چندھیا کر اندھیرے میں پھینک دیتی ہیں۔

تمہاری نظروں میں مصمصام دین ایک ادنیٰ بیراتھا۔ جب تمہیں اس کا علم ہوا کہ مصمصام دین تمہیں بیاہنا چاہتا ہے تو کسی مذہب کی دیوار تمہارے سامنے کھڑی ہوئی نہ تھی بلکہ تم نے سب کچھ ٹٹا کر بھی خود کو اتنا ادنیٰ اٹھایا تھا کہ مصمصام دین اپنے پنجوں پر کھڑا ہو کر بھی تمہارے پیرزں کو چھو نہ سکا اور تم نے ایسے تہقبہ لگائے کہ اُن کی گونج سارے سین سناٹی دینے لگی مصمصام دین

تضحیک کے اس زہر کو پی کر کچھ اس طرح سکڑا اور سمٹ گیا کہ اُس کی کڑیل اور
 تنومند جوانی صرف فیوزے کا ایک پیرا ہو کر رہ گئی جو تمھیں ہر آنے والے کی
 بانہوں میں جھونتا ہوا دیکھ کر بھی تمھارے احکام کی تکمیل میں بھاگا بھاگا پھرتا
 رہا اس لیے کہ یہ اُس کا فرض تھا، وہ فیوزے کا پیرا تھا۔ ہنسن کا ملازم جسے
 میز پر ڈپ دے کر بھی تم اُسے ذلیل کرنے کے لیے اس طرح ہنسا کرتی تھیں
 جیسے اُس کے ذہنی دیوالیہ پن پر ترس کھا رہی ہو کہ اُس نے کبھی تمھاری
 تمنا کی تھی۔

کوش بہٹ دھری چھوڑ دو — مان لو — مان بھی لو کہ آج شالوجہ
 کا مستقبل مختلف ہوتا اگر تم صمصام دین کی ہو کر رہ سکتیں۔ تمھاری زندگی
 میں یکے بعد دیگرے آنے والے مردوں کے انہرہ میں صمصام دین اسی لیے تو
 سب سے مختلف تھا کہ وہ کبھی قوت خرید رکھنے کے باوجود تمھیں رات بھر کے
 لیے خرید نہ سکتا تھا۔ اس مجبوری کے لیے اُس کے دل میں تمھاری محبت کا کوئی
 ایسا جذبہ نہاں تھا کہ وہ تمھیں بازار میں جکتا ہوا دیکھ کر بھی یہ سوچتا تھا کہ تم اُس
 کے گھر کا احسن ہو۔ اُس کے گھر کی زندگی ہوا اور وہ رات جب تمھارا اُس کا ساتھ
 ہو گا تو پھر اس رات کی کوئی ایسی سحر نہ ہو گی جو تمھیں اُس سے جدا کرے۔
 صمصام دین نے اپنے اسی تصور اقی پاکبازی کے نتیجے میں تمھیں کھو دیا
 ہے۔ شراب خانے میں مصلے بچھا کر نماز پڑھنا تمھیں بتاؤ کوئی دانش مندی ہے؟

— باتم تو وہ تھیں کہ رام مندر کو صرف اس لیے پو جا کر جایا کرتی تھیں کہ
 مہنت کا نوجوان لڑکا تم پر اس درجہ فریفتہ ہو گیا تھا کہ تمہارے اُس کے میل
 کو روکنا بھگوان کا بھی ردگ نہیں رہا تھا — وہ تو مہنت کی دوش پر جنم جنم
 کی عبادتوں کی گھڑی تھی اُس کے بوجھ کے نیچے تم دب گئیں — یا پھر
 بھگوان اور بھگوان کی آنکھوں کے بعد کا فرق جاننے والی اُس کی نظریں
 تھیں کہ اُس نے فوری بھانپ لیا اور پھر تم کبھی رام مندر کا رخ نہ کر سکیں
 اس لیے کہ تمہیں قتل کر دیے جانے کی دھمکی دی گئی تھی — تم نے مگر جو
 کچھ کیا تھا بہت ہی سمجھ داری سے کیا تھا۔ یہ ادبیات ہے کہ جھیل کے یہ
 پیسے پھول تو تم بھگوان کے چرنوں میں چڑھا سکیں۔ لیکن جھوک کر وہ پھول
 اٹھا بھی نہ سکیں جو مہنت کے نوجوان لڑکے نے تمہارے چرنوں میں چڑھائے
 تھے۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کہ شکیا کہ تمہاری بنی نہیں — لیکن صمصام دین
 بجائے اس کے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر رات بھر کے لیے تم سے سودا کر لیتا تمہاری
 پوجا کرنے لگا — جس راستے سے وہ تم تک پہنچ رہا تھا وہ اتنا طویل تھا کہ
 تم اس کی پہنچ سے باہر ہو گئیں — ہاتھ بڑھا کر جس شے کو حاصل کیا جاسکتا
 ہے اُس پر للچائی ہوئی نظریں ڈال کر رہ جانا دانشمندی نہ کہی، بزدلی بھی
 نہیں ہے — صمصام دین بیچارہ تو مصلے اور ٹھہ کر چلا تھا اور جس وقت اس
 نے یہ مصلے بچھایا ہے اُس وقت تک قبلہ اپنا رخ بدل چکا تھا۔

ٹیٹ کے لوہے کی سلاخوں کے ذریعہ پٹ ایک دوسرے سے ٹکرا کر
ٹھنار ہے تھے یقیناً کوئی گیٹ پر تھا جو اُسے اس لیے پیٹ رہا تھا کہ
نذر ہو تو توجہ کر سکے۔

اندھے ہیں — کوشلیا نے دل ہی دل میں کہا — گیٹ پر پڑا ہوا اتالا
نظر نہیں آتا — اپنے اطراف مبنے ہوئے خیالوں کے جال سے نکل کر وہ
سے نیچے اُتری اور جھانک کر دیکھا تو کوئی نوجوان جوڑا جو نیا نیا بیاہ
م ہوتا تھا گیٹ کو پیٹ رہا تھا — واقعی ایک دوسرے کے نشے میں
ت میں بیچارے کہ اتنا بڑا قفل نہیں نظر آتا — لیکن اُس نے دیکھا کہ
ان عورت نے مرد کو ہنس کر کچھ بتلایا — پھر دونوں لوٹنے لگے تو مرد نے
ت کو قریب کر لیا۔ اس منظر نے کوشلیا کے ذہن پر کوئی خاص نقش نہیں
را — وہ سوچ سوچ کر شاید اب تھک گئی تھی — اُس کو بھوک محسوس
ہ تھی — سرزد کر رہا تھا — اپنے ہی دل کی دھڑکن کنپٹی کے راستے
ن کے پردوں پر دستک دے رہی تھی — وہ سوچنے لگی کہ صمصام دین
تعلق اتنی دیر تک سوچ کر اُس نے وقت ضایع کیا ہے — شانوجہ کی
فی میں اب نہ اس حد تک گر گئی ہے کہ صمصام دین کے بارے میں بھی
یدگی سے سوچنے لگی ہے — اب اُس کو ایک عجیب سی جھلکاہٹ ہونے
— اُسے یوں محسوس ہوا جیسے فضاؤں میں بلندی پر اڑتا ہوا پرندہ

بیکای زخمی ہو کر زمین پر آ رہا اور جھاڑیوں میں پھنسا بیچ رہا ہے — مرنا
 ہو تو اتنی بلندیوں پر مڑ جائے کوش کہ نصا کی دستوں میں بیجان ہونے کے
 بعد پتہ بھی نہ چلے کہ جسم کہاں گرا ہے — اب تم مصمام دین کے بارے
 میں سوچو گی؟ — وہ عورت جس نے سیدھے منہ سینے سے بات نہیں کی وہ
 بھلا اُس کے سینے کے لیے سوچے گی — گراوٹ پر اس قدر تاسف ہوا تو
 وہ خود کو کمزور سی نظر آنے لگی اور بھوک نے آخر میں اس کے ذہن کو پوری طرح
 اپنی گرفت میں لے لیا۔

چھینکے پر ٹنگی ہوئی بانڈی کو اُس نے اتار کر دیکھا تو اُبلے ہوئے چادرلوں
 کے ساتھ کوڑی میں تھوڑا سا سالن بھی رکھا تھا — اُسے یاد آیا کہ صبح کو اُس
 نے کچھ پکایا ہی نہیں — کاکا بی نے ناشتہ بنایا تھا — اور یہاں سے جانے
 تک کئی بار وہ اُس سے کہہ چکا تھا کہ وہ کچھ کھاپی لے — وہ کھانے پر جٹ گئی
 — ٹھنڈے چادرلوں اور سرد سالن میں جس پر گھی جم گیا تھا اُسے بہت مزہ آیا —
 وہ دلدل پونچھ کر اُس نے کھا لیا۔ کھانے سے پہلے اُس کے دل میں شراب کی خواہش
 پیدا ہوئی تھی — ٹھنڈی ٹھنڈی بیر کے لیے اُس کا جی لپچایا تھا لیکن جب وہ
 گلاس بھر کر پانی پی چکی تو بیر کی خواہش اُس کے ذہن سے بالکل محو ہو گئی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر تو یہ سے چہرہ خشک کرنے کے بعد جب وہ اپنے ہاتھ پونچھ
 رہی تھی تو اُس کی آنکھیں ٹٹکی لگائے خالی خالی نظروں سے جھیل کی شوافط کو گھور

رہی تھیں۔ پانی کی سطح جس طرح پُر سکون تھی اُس کی آنکھیں بھی کم و بیش ایسی ہی تھیں۔ اپنے اطراف سے بے نیاز وہ بلا کچھ سوچے پھوس کے جھونپڑے میں چلنے لگی۔ کھاٹ پر لگے ہوئے بستر نے ایک ذرا سستانے کو اُکسایا تو وہ بستر پر لیٹ گئی۔

میں شانوجہ کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ اُس نے چار دنوں میں پہلی بار سوچا۔ شانوجہ کے لیے اس دن میں جگہ تو زندگی بھر رہے گی۔ دل میں جگہ تو کتنوں ہی کے لیے ہے لیکن ساتھ کسی نے نہیں دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ آنکھیں خشک ہو گئی ہیں تو رات بھی خشک ہو گئی ہے۔ میں جہنم کس کس کے لیے روتی رہوں گی۔ اور اُس کی آنکھیں مُند نے لگیں اور پھر زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ وہ نیند کی آغوش میں بے سُود ہو چکی تھی۔

سوتے جاگتے اس نے ایک آدھ بار شانوجہ کو کبھی خواب تصور میں دیکھا بھی لیکن بیداری اور خواب کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل چکی تھیں۔ وہ گہری نیند سو جاتی پھر نیم خوابی کے عالم میں کرڈٹ بدل لیتی اور پھر دنیا سے بے نیاز ہو جاتی۔ اُس کی نیند پوری طرح اُس وقت ٹوٹی جب اُس نے خواب میں دیکھا کہ شانوجہ خوبصورت سی دلہن بنا اپنے دو دھاکے گھر جا رہا ہے۔ پھر رات کے لوگوں نے چلا نا شروع کیا۔ دلہن لڑکی نہیں ہے لڑکا ہے۔ یہ تو مرد ہے۔ مرد ہے یہ۔ اور جب اُس کی آنکھیں اُس

کے ذہن کے ساتھ بیباک ہو رہی تھیں تو اُس نے دیکھا کہ شانوجہ کا باپ کھائی کے منہ پر کھڑا پیلے گلاب اُس میں پھینک رہا ہے۔ پھر وہ آنکھیں مل کر پلک جھپکانے لگی۔ پھوس کی چھت سے اُس کی نظریں ٹکرائیں۔ اُس نے کروٹ لی۔ اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور کا اُس کی طرف پشت کیسے ہوئے اسٹوڈنٹ پمپ، کر رہا جس کی آواز وہ سن رہی تھی۔ پھر اسٹوڈنٹ پر نیلے اور ہرے رنگ کا شعلہ تھرک رہا تھا اور کانے اٹھ کر کیتلی اسٹوڈنٹ پر رکھ دی تھی۔

”کب آئے ہو؟“ کو شلیا نے بڑی زحی سے پوچھا۔
 ”دیر ہوئی۔“ کانے اُس کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

”کس طرح آسکے ہو؟“

”گیٹ پھلانگ کر“

”کیا کر سکے گا؟“

”کچھ نہ کر سکا۔“ اُس نے نظریں جھکائے ہوئے کہا جیسے قصور وار ہو۔
 — وہ اب برہنہ بستی چھوڑ چکا ہے لیکن آج ہی رات کے کسی جھتے میں یہاں آجائے گا۔ برودے گسٹ ہاؤس کا کوئی کمرہ چھانوں کے سروار نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ رات اسی کے ساتھ ٹھہرے گا۔ مصمصام دین نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔ میں نے شانوجہ کو دیکھا ہے۔ تم

بھی دیکھ گئی تو پہچان نہ سکو گی۔ میں نے اُس سے ملنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن خاندان کے سردار نے مجھے اجازت نہیں دی اور نہ شافو جہ ہی اس پر راضی ہوا۔ زمانے لباس وہ بالکل تمھاری طرح لگتا ہے۔ مجھے تو اس حد تک دھوکا ہوا کہ میں سمجھا تم آگئی ہو لیکن منٹ بھر میں میری غلط فہمی دُور ہو چکی تھی۔

کیتلی میں چائے کی پتی ڈال کر کاکا نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور کوشلیا کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیا کہ جس وقت وہ لوٹا ہے یہ خط اُسے گیٹ کے اندر احاطے میں پڑا ہوا ملا۔ ساتھ ہی کاکا نے کوشلیا کے آگے تجویز پیش کی کہ گیٹ کے پاس ایک میٹر بکس لگا دینا چاہیے ورنہ ڈاکہ کتنے ہی خطوط اس طرح ضائع کر دے گا۔ کاکا نے کچھ اس بھو لین سے یہ بات کی کہ کوشلیا زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ لے دے کر اُس کے پاس دو ہی آدمیوں کے خطوط آتے ہیں۔ ایک ڈیر بالڈ کے دوسرے پنڈت پرشاد کے جو اُس کے بچپن میں اُس کا اتالیق تھا اور جو آج بھی اپنا ڈکھ درد لکھ کر اُس سے پیسے منگواتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوشلیا کے نام اُلٹے سیدھے ناموں سے ایسے خطوط بھی آتے جن میں اُس سے عشق جتایا جاتا یا پھر فحش مذاق کیا جاتا۔

کوشلیا نے خط کی تحریر پر نظر ڈالی اور پہچان گئی کہ یہ ڈیر بالڈ کا خط

ہے۔ لکھا تھا:

’دشمن ہوش، میری کوش — پیار

چوتھے دن مختار سے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اس چکر میں بھی مختار سے لیے
 ٹرانسپورٹ لاسکوں گا۔ وہ دوست ہی غائب ہے جو اسمگل کرتا تھا۔ لیکن
 ایک ایسی چیز لا رہا ہوں جو تم خوش ہو جاؤ گی۔ اُس دن بلا شرکت غیرے میری
 رہو گی۔ کسی سے کوئی اینگجمنٹ نہ کر بیٹھنا۔ شانوجہ سے متعلق مختار
 خط پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ تم بہر حال ماں ہو۔ صبر کرو۔ مختار سے اس دکھ
 کے ساتھ میرے ذہن میں مختار سے پیار سے لال کا چہرہ بھی اُبھر آیا ہے جسے
 تم ’’روشن ڈیر‘‘ بھی کہتی تھیں۔ ایک بار راستے میں ملا تھا۔ پھول
 کر جنگل بھینسہ ہو گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ شہر کے کسی بڑے گتہ دار
 کے ساتھ مل کر کاروبار کر رہا ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ کوئی چار
 بار بروڈے گسٹ ہاؤس جا چکا ہے۔ فیروزے میں پی ہے۔ بروڈے میں ٹھہرا
 ہے اور تمہیں یہ جان کر دکھ ہو گا کوش کہ وہ شانوجہ سے ملتا رہا ہے۔ حیرت
 ہے کہ تم نے ایک بار بھی اُسے نہیں دیکھا۔ کہنے لگا کہ ایک دن خسر اور
 داماد مل کر چلیں گے۔ یعنی وہ اندر میں۔ میں پہلے تو اُس کی یہ بات سمجھ نہ سکا
 اور مجھے اُس کا مذاق چونکہ کھل گیا تھا اس لیے ذرا تڑپتی سے وضاحت چاہی
 ۔۔۔ بڑے ہی اطمینان سے اُس نے کہا کہ۔۔۔ تم شانوجہ کے باپ ہوتے ہوتا

اس لیے کہ شانوجہ کی ماں سے تمھارا یارانہ ہے اور جب شانوجہ سے میرے
 تعلقات ہیں تو کیا میں تمھارا داماد نہیں ہوا؟ — عجیب پاچی آدمی ہے۔
 — کیسا گریہ مسکین سادہ کھائی دیتا ہے — کہتا تھا ساس صاحبہ کو سلام لکھو۔
 شانوجہ کے حُسن کی تعریفیں اس طرح کرتا ہے کہ تم سنو گی تو شرمنا جاؤ گی
 خیر چھوڑ دو بھی تم اپنی صحت کا خیال رکھو — کڑھنے ادر برباد کرنے سے
 کیا ملے گا بھلا — یہی تا کر وقت سے پہلے بڑھی ہو جاؤ گی — زندگی کے
 ایک ایک سانس کو جھوٹی پتی مسرتیں بنو رہے ہیں کہ لیے وقت کرو۔ شانوجہ
 اب اتنا آگے جا چکا ہے کہ تم اُس کو اب واپس نہیں لا سکتیں — ہاں شہر
 میں ایک بار تمھارا فیوزک بنیں بھی ملا تھا — ویسے جب سے اُس نے گاڑی
 خرید لی ہے کبھی کبھی ہفتے کے روز اس سے علیک سلیک ہو ہی جاتی ہے۔
 — پردوں ملا تو بطور خاص گاڑی روک لی۔ فیوزے کے لیے بہت سامان
 لے جا رہا تھا — کہنے لگا یہ سب آپ ہی لوگوں کے لیے ہے۔ بہت دنوں
 سے آپ نے ادھر کا رخ نہیں کیا — کہیے کب آئیے گا — میں نے اُسے
 بتایا کہ بہت جلد آ رہا ہوں — پیارے لال کے بیانات کی تصریح بھی فیوزک
 ہینس سے میں نے باتوں باتوں میں کر لی ہے — تمھارے متعلق اُس نے ایک
 ریمارک کیا — کہنے لگا، اب تو تم خود بھی کماتی ہو اور بیٹے کو بھی کمائی کے
 لئے تیار کر دیا ہے — میں نے تردید کی ہے اور منہ دکھی بات نہیں۔ تمھاری

جتنی تعریف کی جا سکتی تھی میں نے کی ہے اس لیے کہ تم ہو تعریف کے قابل۔
 — شافوہ کے معاملہ میں میں نے بتایا کہ تم بالکل بے تصور ہو — لیکن
 وہ کہتا ہے کہ میں تمہاری مشاطرانہ چالوں کو نہیں سمجھتا — یہ دنیا ہے جتنے
 منہ اُتتی باتیں — تم کس کس کا بُرا مانو گی — تم نے کتنے ہی بار اپنے
 دل کے نازک مشیشے کو پتھر زوں سے ٹکرایا ہے — اب کچھ یوں کر دو کہ اس
 مشیشے ہی کو پتھر بنا لو — اسی میں تمہاری سلامتی ہے، بہتری ہے — میں
 نے دیکھا ہے کہ دنیا حساس لوگوں کا جہنم ہے — جتنی سخاک بن سکتی ہو
 بن جاؤ، خوش خوش جی سکو گی۔

اچھا — اچھا میں تم سے مل رہا ہوں — بہت جلد — انتظار
 کر دے گی نا؟

تمہارا

پیارا گنج، ڈیر بالڈ سعید الزماں

کو شلیا نے خط ختم کیا تو آن پخل سے اُس کو آنسو خشک کرنے پڑے۔
 "کس کا ہے؟" — کا کانے بھانپ کر پوچھا اور چائے کی پیالی
 کو شلیا کی طرف بڑھا دی۔

پیالی لیتے ہوئے کو شلیا نے کہا — "ڈیر بالڈ کا۔"

"سعید زماں کا؟"

”ہاں کا کا“

”اُس نے اپنا کیا ڈکھ درد لکھا ہے کہ تم رونے بیٹھ گئیں — تم کس کس کو رو رو گئی؟“

کوشلیا نے کا کا کو کوئی جواب نہیں دیا — نظر بھر کر ان کو پیار سے دیکھا — کا کا کی باتوں سے ڈیر بالڈ کے خط کی طرح چاہت کی بُرائی تھی — اُس نے اُسے نچوڑ کر ایسی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلانی جو نہ اتنی جاندار تھی نہ بالکل بیجان۔

چمن کے گیٹ پر آہٹ پا کر کا کا باہر نکل گیا تو کوشلیا نے کھاٹ کے نیچے سے اپنی پیٹی کھینچ کر باہر نکالی اور ڈیر بالڈ کا خط اُس میں محفوظ کر دیا لیکن اُس کا جی چاہا کہ خط کو پھر ایک بار پڑھے — اُس نے خط نکال کر چولی میں اڑس لیا اور پیٹی کو کھاٹ کے نیچے ڈھکیں کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر چمن کی طرف کوشلیا نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ کا کا اُس جوڑے کو گیٹ کے اندر لا چکا ہے جو پہلے گیٹ پیٹ پیٹ کر اور پھر قفل دیکھ کر لوٹ گیا تھا۔

لڑکی کا چہرہ، چال اور قد و قامت بے انتہا پرکشش تھے، اتنے کہ کوشلیا نے دیر تک اپنی نظریں اُسی پر جمائے رکھیں۔ پھر اُسے لڑکا بھی اچھا لگا۔ سچل اور بانکا — اُس کے ذہن میں کسی بھولی بسری یاد کی ایک لہری اُٹھی اور ماضی کے سمندر میں گم ہو گئی — وہ جب شانوبر کے

باپ کے ساتھ شہر بھاگ آئی تھی تو ایک ریلوے اسٹیشن پر کسی بڑھیا
 مسافر نے بڑے چاؤ سے اُنھیں دیکھ کر کہا تھا — کسی پیاری جوڑی
 ہے — میں نے بال سفید کر لیے لیکن آج تک ایسی جوڑی نہیں دیکھی
 — بیوی بہت حسین ہوتی ہے تو شہر اُس کے برابر میں نہیں جھٹتا
 — بعض اچھے، وجیہہ اور شاندار شوہروں کی بیویاں گول مول اندر
 بے سنگم سی ہوتی ہیں لیکن جوڑی ہو تو ایسی ہو کہ بھگوان نے ایک دوسرے
 کے لیے ہی بنائی ہے۔

اور کوشلیا نے ایک روپیہ کا کرانا نوٹ اس بڑھیا کو ٹرین سے
 اُترتے وقت دیا تھا۔

جب وہ لوگ پھوس کے جھونپڑے کے قریب آ گئے تو کوشلیا دروازے
 کی ادھڑ سے ہٹ آئی تاکہ وہ اسے دیکھ نہ سکیں۔ اُس کے ذہن میں اپنے
 حُسن کا احساس بیدار ہو چکا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس ہیئتِ کدافی
 سے اُن کے سامنے جائے جب کہ نہ اُس کے بال دُرست اور نہ چہرے پر
 پھین تھی۔

وہ اندر کھسک آئے لیکن اُس نے دیکھا کہ یہ جوڑا دروازے کے پاس آ کر
 رُک گیا تھا اور دونوں ہی کا کا کے سلیقے کو سراہ رہے تھے — اُس نے
 لڑکی کی آواز سُنی۔

”ایسی جھونپڑی لے تو میں خوشی خوشی رہ جاؤں۔“

پھر اس کا ساتھی نوجوان کہنے لگا — ”یہ جھونپڑا کہاں ہے یہ تو اچھا خاصہ چھوٹا سا گھر ہے۔ بے حد خوبصورت سا — پھوس کے چھت پر پھیلی ہوئی یہ لال لال کچھے دار پھولوں کی بلیں، یہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں — یہ قطار باندھ کر گھیرے ہوئے پیلے گلاب — یہ کیاریاں، یہ جھیل، یہ منظر تو ایک جیتا جاگتا منظر ہے سو توئی (So lovely) ”آپ ہمیں اپنے پاس رکھ لیجئے نا“ — بانگی لڑکی نے بڑی ادا سی سے کا کا کو مخاطب کر کے کہا۔

کوشلیا نے جب یہ باتیں سنیں تو اُس کا جی چاہا کہ چیخ پڑے — تم خدا کے لیے یہاں مت رہنا۔ بھگوان کی سوغند اس خیال ہی کو اپنے ذہن سے نکال دو — مذاق میں بھی یہ نہ سوچو — وہیں واپس جاؤ جہاں سے آئی ہو۔ یہاں میں نے بھی ایسی ہی باتیں کی تھیں — کا کا نے مجھے اور شانو کے باپ کو اس خوبصورت سی کٹیائیں اسی طرح جگہ دی تھی جیسے اپنے دلائیں جگہ دے رہا ہو — لیکن آج جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو کھل کر رو بھی نہیں سکتا — تمہیں معلوم نہیں پھر یہی مجھے دلا پھول کی بلیں سانپ بن کر تمہیں ڈسیں گی۔ یہی پیلے گلاب خار بن کر تمہیں چھبیں گے۔ یہ مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچائیں گے بلکہ

آفسوؤں کے کنکر ہمیشہ کے لیے تمھاری آنکھوں میں کھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔ یہاں جب لڑکی ماں بننے کو ہوتی ہے تو کھائی میں پھلانگ لگا کر خود کو چھپالیشتی ہے اور اگر ماں بن چکی ہے تو وہ بچہ نہیں پیدا کرتی شادوہ پیدا کرتی ہے — تم شادوہ پیدا کر سکو گی؟ — تم میں اتنی ہمت ہے کہ تم شادوہ پیدا کر سکو اور اُس کی ماں کہلاؤ؟

اور کوشلیا سسک سسک کر رونے لگی — اُس نے چاہا کہ اپنی سسکیوں کو اس طرح دبائے کہ نوجوان جوڑا سن نہ سکے کہ کوئی جھونپڑی کے اندر سسک رہا ہے۔ اس جھونپڑی کے اندر جس کی چھت پر چھے دار لال پھولوں کی بیلیں ہیں — جو قطار در قطار پیلے گلابوں سے گھری ہوئی ہے جس کے آس پاس رنگ برنگی پھولوں کی کیاریاں بھیلی ہوئی ہیں — جس کے آس میں جھیل ہے اور جھیل میں ڈولتا ہوا بکرہ ہے۔

وہ کامیاب تھی — نوجوان جوڑا جھیل کی طرف بڑھ چکا تھا — اُس نے کوشلیا کی سسکیاں نہیں سنی تھیں۔

بکرے میں جھیل کی سیر کر کے جب یہ جوڑا جا چکا تو کانے کوشلیا سے کہا۔

”منہ ہاتھ دھو کر تازہ ہو جاؤ کوش۔ لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں ویسے تیراجی نہ چاہے تو لوگوں سے نہ ملنا — لیکن باہر نکلنے اور جھیل کی سیر

کرنے سے شاید تیرا من بہل جائے۔"

کا کا نے ابھی بات بھی ختم نہیں کی تھی کہ کوشلیا نے چوٹی میں اپنی دو انگلیاں ٹھونس کر ڈیر بالڈ کا خط نکالا اور پھر پڑھنے لگی۔

"دشمن ہوش میری کوش — پیار

چوتھے دن تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں — اس چکر میں بھی تمہارے لیے ٹرانسٹر.....

معا کوشلیا کو خیال آیا، وہ چوتھا دن آج ہی تو نہیں ہے اور اُس نے خط پر تاریخ نہ لکھی — اُس کی ایک کرن سی اُس کے ہاں خانہ دل کے تاریک گونٹے میں بھی جا پہنچی۔ جب اُس نے انگوٹھے اور چھنگلی کو جوڑ کر حساب لگایا کہ آج کا دن ہی چوتھا دن ہے، خوشی کے ساتھ ساتھ اُسے ڈیر بالڈ پر غصہ بھی آیا کہ وہ ہمیشہ ہی اپنی آمد کی صحیح اور قطعی تاریخ نہیں لکھتا — دوسرا دن 'چوتھا دن'، پانچواں دن، بھلا یہ بھی تاریخ کے تعین کا کوئی انداز ہوا — لیکن ایک بھولی بھنگلی مسکراہٹ بھی جانے کہاں سے اُس کے ہونٹوں پر آگئی — ایسی حرکتیں ڈیر بالڈ دانت کرتا ہے۔ وہ سوچ سوچ کر مسکرا پڑی۔ جس روز آنا ہوتا ہے اگر وہ نہیں آتا ہے تو دوسرے دن ضرور دھمک جاتا ہے اور پھر حساب جوڑ جوڑ کر کوشلیا کو قائل کرتا ہے کہ وہ دقت پر پہنچ گیا ہے اور بالکل بے قصور ہے اور کوشلیا کا سچا بھی خواہ 'چاہنے والا اور

وفا دار ہے۔

ڈیر بالڈ کی شرارتوں نے دن بھر میں پہلی سُکراہٹ تو دے ہی مادی ہے۔
 کوشلیا نے ڈیر بالڈ کی چاہت میں کچھ اس طرح سوچا اور آج اُس کی آمد
 کی جو اُمید سی بندھی وہ دل ہی دل میں بڑی حد تک مطمئن اور مسرور ہو گئی۔
 اپنے چہرے پر ٹھنڈا پانی اُچھالتے ہوئے وہ تصورات کے تانے بانے
 میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس کے لیے بات بڑی حد تک اطمینان قلب کا باعث
 تھی کہ آج ہی رات کو شانوجہ بھی آ رہا ہے۔ کا کانے بتایا ہے کہ وہ بھی
 برودے میں ٹھہرے گا۔ ایسے میں ڈیر بالڈ کی آمد اُس کے لیے تقویت اور
 ہمت کا باعث تھی۔ ڈیر بالڈ سے کہہ کر میں بھی برودے ہی میں ٹھہر
 جاؤں گی۔ اُس نے سوچا، اس لیے ڈیر بالڈ کچھ دن سے جب بھی ادھر
 آتا کوشلیا کے پاس جھونپڑے ہی میں ٹھہرنے لگا تھا۔ لیکن یہ بات صرف
 ڈیر بالڈ ہی کے لیے مخصوص تھی۔

”سُنھ ہاتھ دھو کر جب کوشلیا اُٹھی تو اُس نے ایک بھر پورا نگرانی بی پھر
 اس کا جی چاہا کہ گنگنائے۔ لیکن وہ گنگنا نہ سکی۔

پھر کچھ سرچ کر بجائے اس کے کہ آئینے کے مقابل ہو کر وہ شگہار کرنے لگتی
 اُس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ وہ دیر تک ہناتی رہی۔ نہایت ہو کر جب وہ
 آئینے کے سامنے آئی تو اپنے لمبے لمبے بالوں کو تو لیے میں پیٹ کر وہ گنگنا

دی تھی۔

”ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک۔“

پہلا مصرعہ ذہن پر بار ڈالنے کے باوجود اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔
ڈیر بالڈ کا پسندیدہ یہ شعر جب بھی وہ ترنگ میں ہوتا اپنی بے سری آواز
میں لہک لہک گاتا تھا اور کوشیا ہنس ہنس کر داد دیتی تھی۔

کیڑے پہن کر بال سنوارتے ہوئے اپنا عکس آئینے میں اُس نے دیکھا۔
وہ آج بھی کتنی سچل ہے، دیکھے جانے اور چاہے جانے کے لائق۔ لیکن اُس
کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ جب کا کا کی کہی بات اُسے یاد آئی۔

زنا نہ لباس میں شان و جد بالکل بہاری طرح لگ رہا تھا۔ مجھے تو
اس حد تک دھوکا ہوا کہ میں سمجھا تم آگئی ہو۔“

شان تو نے جب دنیا میں آنکھیں کھولیں تو میری دنیا میں کیسے اُجالے
سے بکھر گئے تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ تیرا باپ جس نے جہنم جہنم تک
میرا رہ کر زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی تھیں مجھے یوں ترپتا ہوا چھوڑ کر
چلا جائے گا کہ تجھے اپنے وجود میں چھپائے میں اپنے گھر بھی نہ لوٹ سکوں گی۔
جہاں میری ماں مجھے رو رہی تھی۔ جہاں شہوت کا وہ زرخٹ مجھے روز رہا تھا
جس پر میں کالج سے لوٹ کر چڑھ جاتی تھی اور لال لال کا لے کا لے شہوت
توڑ توڑ کر مرے سے کھاتی تھی۔ میرے چھوٹے سے گھر کی وہ کھڑکی مجھے

روز ہی تھی جس کی ٹھنڈی سلاخوں کو ہتھیلیوں سے چھو کر میں ایک گدگدی سی
 محسوس کرتی تھی اور پھر اس کھڑکی پر بیٹھ کر سامنے شنشنگ کرتے ہوئے
 انجنوں اور زندنا کر گزرتی ہوئی ٹرینوں کو دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی کہ لوگ تیزی
 سے زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات سے متعلق سوچنے کی فرصت
 بھی نہیں ملتی۔ اور ہاں وہ تیلی راجہ جو ایک تارے پر رام لپلا گاتا تھا۔
 عمر کے تفادات کے باوجود وہ میرا کیسا دوست تھا۔ میں چپکے سے ماں
 کے صندوق سے پیسے اڑا لاتی اور اُس کی بند مٹھی میں رکھ دیتی۔ وہ بھی
 تو کبھی مٹھی کھول کر دیکھنے کی زحمت نہ کرتا اور اک تارا چھڑ کر بھجن گانے کے
 لیے بیٹھ جاتا۔ اُس کی آواز باریک سی تھی۔ کیسی رسیلی! کبھی کبھی تو پیسے
 نہ ہوتے تو میں اُس کی مٹھی کھول کر اس طرح اُس کی ہتھیلی میں چٹکی بھرتی جیسے
 پیسے جما رہی ہوں اور پھر خود ہی مٹھی بند کر دیتی۔ وہ مُسکراتا، خالی ہاتھ
 اس طرح اپنی لمبی کرتنی کے حیرت میں ٹھونس کر خانی کر دیتا جیسے وہ ریزگار
 سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھر اک تارا چھڑتا۔ ماں بھی پلو سر پر ڈال کر
 میرے پیچھے کھسک آتی۔ اور ہاں وہ شریرونڈا جس کی ماں میری ماما جی
 کے پاس آتی جاتی تھی۔ کیسے دیدے شکامشکا کر مجھ سے کہا کرتا تھا۔
 'مجھے بالکل اپنی جیسی پتی لاندیا پھر تم ہی اتنی چھوٹی ہو جاؤ کہ میں تمہیں
 بیاہ سکوں'۔ یہ باتیں اُس کی ماں نے اُسے سکھائی تھیں۔ سنتی ہوں

کہ ماں مر گئی ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ماں کی اس سہیلی نے آخری وقت تک اس کی نگرانی کی ہے۔ میری ماں کو میرے غم نے ہی تدا رہا ہے۔ شاذ و بہ لیکن میرا دل نہ پسچا۔ کیسی شرم و امن گیر تھی۔ تجھے پریٹ میں چھپا کر بھی تو میں اپنی ماں کے سینے سے لگ کر رو سکتی تھی۔ سارے پاپ دھل جاتے تھے۔ اور نہ بھی دھلتے تو کیا ہو جاتا۔ غم کے وہ بادل تو دل پر سے چھٹ ہی جاتے۔ آج جن کے سائے میں کتنے ہی انجانے راستوں پر میں بھٹک بھٹک گئی ہوں اور ان راستوں پر مجھے صرف تیرا سہارا ہی تھا شاذ و بہ! لیکن تو نے بھی اچھا کیا۔ لوگ کہتے ہیں یہ کلجگ ہے جو جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ ان نے تڑپ تڑپ کر پتہ نہیں۔ مجھے کیسی بد دعا دی تھی کہ تو آج مجھے رلا رہا ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔ اُس کی جہنم ساری محرومیاں بٹور کر میں اگلے جہنم کی تیاریاں کر لوں گی لیکن اس طرح جی لینا تو سہل نہیں ہے۔

رنج و غم کے وہ بادل جو تین روز سے کوشلیا کے سر پر سایہ فگن تھے ذرا کی ذرا چھٹے تھے۔ خوشی کی تازہ اور نرم دھوپ اُس کے وجود میں پھیلی تھی اور نہانے کے بعد سکرا ہنٹ بن کر اُس کے ہونٹوں پر چھا گئی تھی۔ پھر یہی نرم دھوپ آواز کا جادو بن کر پھوس کے جھونپڑے میں تیرتی پھر رہی تھی کہ شاذ و بہ نے کوشلیا کو پھر اُداس کر دیا۔ اپنے اندر چھپی ہوئی

اس دھوپ چھاؤں کی کیفیت کو ابھی وہ جھٹلا بھی نہ سکی تھی۔

کاکا نے جمیل کی سیر کر کے اس نوجوان خوبصورت جوڑے کو گیمٹ تک چھوڑا اور خود ہی دوپیلے گلاب جاتے وقت اُس نے ان کی نذر کر دیے کیونکہ اپنے اس فرض کو ادا کرنے کے لیے کوشلیا ابھی تک چین میں نہیں آئی تھی۔ نوجوان جوڑا چلا گیا تو کاکا کھٹیا میں چلا آیا۔ کوشلیا سچ دھج کر باہری آرہی تھی۔ کاکا نے اس کو اس عالم میں دیکھا تو اُس کو کوشلیا سے اپنی خوشیاں چھپانی پڑیں۔ دعائیں دے کر کاکا نے صرف اتنا کہا کہ دُکھ درد کا ہنس ہنس کر مقابلہ کرنا چاہیئے کوش۔ کوشلیا نے کاکا کی بات نہ پکڑ کر اُس کو چین میں واپس لاتے ہوئے کہا۔ ”آج ڈیر بالڈ آرہا ہے۔ آج اُس کے ساتھ میں نے سوچا ہے کہ میں بھی برودے چلی جاؤں تاکہ شانوجہ کا وہیں انتظار کر سکوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھوں بھی کہ وہ کس کے ساتھ آتا ہے۔“

”تم کیا کر دگی دیکھ کر۔۔۔ اے دیکھ کر تمہیں زیادہ ہی دُکھ ہو گا۔۔۔ وہ کسی کے ساتھ آئے متعین کسی سے اُلجھنا نہیں چاہیئے۔ خوشی سے اس کا انتظار کر دو تاکہ وہ یہاں واپس آجائے۔“

”میں کچھ نہیں کروں گی کاکا۔ دیکھوں گی کہ وہ مجھ سے آنکھیں چا کر کھتا ہے یا اتنا سفاک ہو گیا ہے کہ اپنے لیے پر اُس کو کوئی پھنسا دے نہیں۔“

سگریٹ سے اُس کی تواضع کی۔ اُس نے بتایا کہ سردار آج شہر جا رہا ہے اور وہ خوبصورت سی لڑکی جو اُس کے ساتھ ہے وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ سردار دل کا لاکھا آدمی ہے — پہرہ دار نے مجھے بتایا — کا کا کہہ رہا تھا اور کوشلیا ہم تن گوشت تھی — لونڈیا کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی پٹاخہ ہے، بڑی پیاری۔ خان کا کوئی منہ چڑھا اسٹنٹ ہے وہ اُسے پہنچانے کے لئے آئے گا — خان بڑا گتہ دار ہے۔ بڑی بڑی سرکاری عمارتیں خان ہی نے بنوائی ہیں۔ برہن بستی میں جذامیوں کا جو دواخانہ بن رہا ہے۔ یہ دواخانہ برہن بستی سے ساڑھے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ خان کی نئی معشرۃ کچھ ہی دیر ہوئی خان کے ساتھ اس نئی عمارت کو دیکھنے گئی ہے۔

میں نے چُپ رہنا ہی بہتر سمجھا اس پہرہ دار سے جس کا نام شاید کلیم خاں تھا، میں نے بس یہ کہا کہ میرا اپنا نورِ نظر یہاں کسی خان کے گھر میں ملازم ہے۔ میں اسی سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس پر کلیم خاں نے مجھے خانوں کے دوسرے گھروں کے پتے دیے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلایا کہ اب اس بستی میں کوئی خان ایسا خوشحال نہیں ہے جو بھاجی ترکاری کے لیے کسی چھو کرے کو ملازم رکھے۔ ویسے سود کا پیسہ ان گھروں میں بھی کم نہیں لیکن دل ہر ایک کے پاس کہاں ہوتا ہے۔

ہڑیل سے نکل کر میں پھر پہرے والے کلیم خاں کے ساتھ باتیں کرتا
 سردار کے گھر تک پہنچا۔ راستے میں باتوں باتوں میں اتنا تو معلوم ہو سکا کہ
 سردار کی نئی معشوقہ یہیں چار چھ میل دور کسی پر فضا مقام بدرستی ہے کلیم خاں
 کو اس مقام کا نام یاد نہیں تھا۔ اُس نے بتایا کہ اس مقام کی بہت باتیں
 سُنی ہیں۔ سنا ہے کہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ ہر اتوار کو بہت سے لوگ دُور دُور
 سے سیر کو آتے ہیں۔ مسافروں کے ٹھہرنے کو جھیل کے کنارے اچھا سا جنگلہ
 ہے۔ میں بھی ادھر جانے کی سوچتا ہوں۔ اس بستی میں زیادہ پُرانا آدمی نہیں
 ہوں، شہر میں رہتا ہوں۔ سردار کے جنگلے پر ملازم ہوں۔ وہ میرے کام سے
 خوش ہے۔ مجھے ترقی دے کر یہاں لے آیا ہے۔ میں یہاں کے پیریداروں
 کا حوالدار ہوں۔ سردار مہینے میں چار چھ بار یہاں ضرور آتا ہے۔ جدام کے
 دواخانے کے کام کا معائنہ کرتا ہے اور مزدوروں میں اپنے سامنے مزدوری
 تقسیم کر داتا ہے۔ دل کا اچھا ہے، نظر کا اچھا نہیں۔ مزدوروں کو اُن کی
 ضروریات پر پیشگی رقوم دے دیتا ہے لیکن کسی کی بہو بیٹی پر بڑی نظر
 ڈالتا بھی شرافت نہیں۔ اپنے ہی ماتحتین کی بہو بیٹیوں پر بڑی نظر ڈالنے
 میں بھی اُس کو عار نہیں۔ یہی ایک بات بُری ہے۔ مہینہ بھر پہلے
 وہ کسی برہمن لڑکی کو لے آیا تھا۔ مگر اس عشق میں خان کو
 بہت پریشانی اُٹھانی پڑی۔ پولیس کو بہت سا دیر کھلایا گیا۔

تب کہیں جا کر مشکل ٹپٹی۔ لڑکی کے ماں باپ بھی شہر کے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ لیکن لڑکی جتنے دن یہاں رہی، میں تمہیں ایمان کی بات بتلا دوں خوش رہی۔ میں نے اُس کو کبھی اُدا اس نہیں دیکھا۔ میں یہ اس لیے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی بھی راضی خوشی تھی۔ لیکن اُس کے والدین نے اغوا کا کیس بنا کر خان کو پریشان کیا۔ لیکن خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اُس نے پولیس ہی کو خرید لیا۔

بم بھی باتیں کرتے سردار کے گھر تک پہنچے تھے کہ بڑا ساموڑا آتا ہوا نظر آیا۔ کلیم خاں نے مجھے ادب سے کونے میں بٹ کر ٹھہر جانے کو کہا اور خود بہرہ داروں کی طرح اسٹن ہو گیا۔

مورچب گیٹ میں داخل ہونے لگا تو اُس کی رفتار بہت ہی کم ہو گئی۔ میں نے شانوجہ کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ لال ساری میں پیاری سی دلہن نظر آتا تھا۔ بالوں کا جوڑا باندھ کر اُس نے جوڑے میں پھول لگا رکھے تھے۔ مورچبیزی میں ہوتا اور اگر میں اُس کی صرف جھلک دیکھ سکتا تو میرے لیے پہچانا مشکل ہوتا۔ مشکل تو مجھے اس وقت بھی ہوئی لیکن خود شانوجہ نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی نظروں نے مجھے اُس کو پہچان لینے میں مدد دی۔

کا کا اُس کے بعد خاموش ہو گیا۔

کوشیا کہنے لگی —

”اور وہ آج رات یہاں پہنچ رہا ہے — خان کا اسٹنٹ اُس کو چھوڑنے کے لیے یہاں موٹر پر لائے گا۔“

کوشیا نے شانوجہ کی کہانی کو ان دو جملوں پر ختم کر دیا جسے اب تک کا کاٹ رہا تھا لیکن یہ دو جملے کوشیا نے اس طرح ادا کیے جیسے کمرہ ربی ہو۔

لمبی سیاہ زلفیں چونکہ اب خوبصورت جوڑے میں تبدیل ہو کر پھولوں کی منظر تھیں اس لیے کوشیا نے جوڑے میں اس گلاب کو ٹانگ لیا جسے شانوجہ کی رد واد سننے کے دوران میں وہ سر نگھتی رہی تھی — اُسے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ یہ پھول کاغذی ہو گئے ہیں۔ اُن میں کوئی خوشبو نہیں ہے۔ اس لیے وہ اور خوبصورت سے گلاب توڑے اور بغیر سر نگھے جوڑے میں سجا کر چین میں اس طرح ادھر ادھر دیکھا جیسے ہر فی اپنی ٹکڑی سے سمجھ کر دیکھتی ہے۔

گچھے دار لال پھولوں کی ہری بیل کے چھپے جو چین کے حصار کی طرح اطراف میں پھیلی ہوئی تھی صمصام دین اسے گیٹ کی طرف آتا ہوا نظر آیا — وہ بہت تیز تیز اس طرف کو آ رہا تھا — گیٹ میں داخل ہوا تو کوشیا مسکراتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی — صمصام دین اس التفات پر

جانہ سے باہر بڑا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا کہ شلیا نے اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”نہم تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہاری ہمدردیوں کے جواب میں کچھ کہہ سکوں۔“

”خاموشی سے کسی بات کا اعتراف کر دینا زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔“
صمصام دین نے اُس طرح کہا جیسے کو شلیا کے سامنے بات کرنے کا سلیقہ اُسے آگیا ہو۔

”مختلایہ وقت تو بڑی مصروفیات کا ہے پھر تم کیسے آگے؟“
صمصام دین کی نظریں کو شلیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ پہلی بار کو شلیا کو ان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
کو شلیا نے صمصام دین کی حالت دیکھی تو اُس کو اُس پر ترس آیا۔ وہ بالکل بھول چکی تھی۔ اُس نے آج ہی بڑی سنجیدگی سے صمصام دین کے بارے میں کچھ سوچا بھی تھا۔

”کیسی کیسی مہمل باتیں میں نے سوچی تھیں۔ کو شلیا پھر اُس موڑ میں آگئی تھی کہ بڑی سفاکی سے اپنے ہی جذبات کا جس کے بارے میں کچھ ہی دیر پہلے وہ سنجیدہ تھی مذاق اڑا رہی تھی۔“
صمصام دین نے خواب سے جوشکتے ہوئے کہا۔

سینس نے سید صاحب سے بچھوایا ہے کہ کوئی پارٹیشن آپ لوگوں کے لئے
 ۱۷۷۷ اس لئے کہ آج لوگ کچھ زیادہ ہی ہیں شاید آپ لوگوں کے آنے تک
 خالی نہ رہیں۔ اس لیے اگر وہ کہتے ہیں تو وزریشن کارڈ لگایا جاسکتا ہے۔
 لیکن وہ ہیں کہاں! — تو وہ یہاں آئے نہیں۔
 ”اچھا — تو پھر آتے ہی ہوں گے — وہ آچکے ہیں۔ میں نے خود
 ہے۔“

”خیر وہ آجائیں گے — لیکن صم تم مسٹر بینس سے کہہ دو کہ ٹیبلن کی
 مت نہیں ہے۔ آج ہم فیوزے نہیں آئیں گے۔“
 ”وہ آ بھی جائیے نا — دل بہل جائے گا۔“
 ”تو گویا تم بینس کی وکالت بھی کرنے لگے ہو؟“
 ”نہیں نہیں — ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو صرف آپ کے
 چاہا تھا۔“

”کوشلیا صمصام دین کی معصوم بو کھلا ہٹ پرٹس پڑی۔
 وہ بھی ہنسنے لگا۔“

”تو پھر کہہ دوں کہ...“

”ہاں بالکل قطعی —“

صمصام دین لوٹ رہا تھا کہ کوشلیا نے ڈیر بالڈ کو گھیٹ میں داخل کرتے

ہوئے دیکھا —

”لو زہ آگئے سعید صاحب“

ڈیر بالڈ کی شخصیت گرے رنگ کے فٹ سوٹ میں نکھر رہی تھی۔ اُس نے قریب آ کر بڑی بے تکلفی سے کوشیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور عصمام دین کی پرزائیکے بغیر زسرا ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال کر اُس کو اپنے بالکل قریب کر لیا۔

کوشیا کے لیے یہ بات کسی طرح نئی نہیں تھی لیکن آج اُس نے عصمام دین کی موجودگی کو جانے کیوں بڑی طرح محسوس کیا اور غیر شعوری طور پر کچھ کھسک کر ڈیر بالڈ سے الگ ہو گئی۔

”کہو ڈارلنگ، کہہ دھر آگئے ہیں یہ عصمام دین بہادر۔ یہ ہینسن کے ہینسن“
عصمام دین، بہادر کے خطاب پر اپنی جھلکی جھلکی نظروں کو اٹھا کر مسکرایا۔
”ہینسن نے بچھوایا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو کوئی کیبن انجیج کیے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ فیوزے میں آج کچھ زیادہ ہی لوگ آرہے ہیں — لیکن میں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”بھلا اس میں ضرورت کا کیا سوال ہے — صرف محسوسات کی بات ہے۔“
ڈیر بالڈ نے کوشیا کے جوڑے کے گلاب کو درست کرتے ہوئے کہا۔
”نہیں آج میں فیوزے چلنے کے موڑ میں بالکل نہیں ہوں — تم سے

”بہت سی باتیں کرنی ہیں“

”باتوں کے لیے فیوزے سے اچھی جگہ کون سی ہو سکتی ہے جان“

”میں نے کہہ دیا نا کہ نہیں“

”تو پھر تعمیل حکم ہو۔“ ڈیر بالڈ نے صمصام دین سے مخاطب ہو کر کہا
— دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اندر پھر بیٹنے لگے۔

صمصام دین جا چکا تو ادھر ادھر نظریں دوڑا کر ڈیر بالڈ نے کوشلیا کی
گردن چوم لی جو کہ پھولوں سے سجے ہوئے جڑے کے نیچے واقعی پیاری لگ
رہی تھی۔

”کاکا یہیں کہیں ہو گا“ کوشلیا نے پرے بیٹھے ہوئے کہا۔

”چلو پہلے کاکا سے مل لیتے ہیں“

ڈیر بالڈ نے پیچھے ہی سے پکار کر کاکا کو سلام کیا جو جوہی کے پردوں کی
جڑوں میں صفائی کر رہا تھا۔

”اچھا ہوا جو تم آگئے ہو سعید میاں“ کاکا نے ڈیر بالڈ کو مخاطب کر کے
کہا۔ ”تین چار روز سے یہ روزہ کر رہا کان ہوئی جاتی ہے۔“ وہ کتھارا خط
آنے پر اس نے آدمیوں جیسی صورت بنائی ہے ذرا نہ ہر کونے کچرے میں، میں
نے اس کے آنسو دیکھے ہیں۔ تم آگئے ہو تو جیسے اسے بہت سی آگئی۔ دیکھو
کس طرح مزے سے مگرا رہی ہے جیسے ان چھ دنوں میں اس پر کچھ بتایا ہی نہیں“

”بات کیا ہے کا کا؟“

”بات کیا ہوگی۔ بس وہی اُس کی قسمت کا چکر ہے۔ لونڈا اب بالکل آدا ہو گیا ہے پہلے فیروزے اور برودے کے اطراف گھوم پھر کر ڈی رات کو سہی آ تو جاتا تھا۔۔۔ کوئی چار چھ دن سے پتہ ہی نہ تھا اور یہ ادھر ادھر کی باتیں سن کر روتی تھی۔۔۔ آج عصام دین نے اُس کا پتہ اُٹھایا ہے۔۔۔ میں بھی بہن بستی ہو آیا ہوں۔ شانوجہ کو دیکھ آیا ہوں، اپنی انہی آنکھوں سے جنھوں نے خوشیاں کم غم زیادہ دیکھے ہیں۔ لیکن شاید مجھ پر بھی یقین نہیں کرتی۔ شانوجہ کی ساری گرد و آلودگی ہے۔۔۔ رہم ہوتی ہے۔۔۔ روتی ہے۔ کہتی ہے کہ اس کی صورت نہیں دیکھوں گی لیکن پھر تھوڑی تھوڑی دیر سے کسی نہ کسی حیلے مجھ سے پوچھتی ہے۔۔۔“

”تم اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ آئے ہونا کا کا؟“

”بگلی کہیں کی۔۔۔ ان دنوں تمھاری اُس کو ضرورت تھی سعید میاں اچھا ہوا جو تم آ گئے۔“

کا کا نے بغیر اُس کے ساری باتیں ڈیر بالڈ کو بتلا دیں اور پھر جو ہی کے پردوں میں جھک گیا۔ جیسے کہ شلیا کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہو۔

ڈیر بالڈ نے کٹیا کا رخ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”جیلو کوش مجھے اچھی سی چائے پلانے۔۔۔ بلکہ میری رائے میں فیروزے چلی چلو۔“

”نہیں — تم ایک کام کرو — میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ تم اس وقت تک برووے میں کوئی کمرہ انگیج کر آؤ — میں نے طے کیا ہے کہ آج ہم برووے میں ٹھہریں گے۔ تم جلدی سے ہو آؤ تو پھر میں تم سے جی بھر کر باتیں کروں۔ ڈرتی ہوں کہ سارے کمرے انگیج نہ ہو جائیں۔“

”گڈ — بہت اچھی بات ہے — تو پھر میں ابھی آتا ہوں — اور ہاں تو میں بھول ہی گیا — وہ دیکھو —“

کوشلیا نے ڈیر بالڈ کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ پتھر کی پنج پر اُس کا خوبصورت سا سُرٹ کیس دھرا تھا۔

”لو چلو میں کیٹیا تک پہنچا دوں —“ دونوں اُس پنج کی طرت بڑھے۔ کوشلیا نے سُرٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھایا — ہلکا ہے — میں لے جا سکتی ہوں۔“

”نہیں جان — میں ان نازک ہاتھوں کو زحمت نہیں دوں گا۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوگا — میں کوئی چھوٹی مری ہوئی۔“

”تو پھر یہ چابیاں بھی لے جاؤ — اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں رکھ لو — میں نے تمہاری پسندیدہ بیر کے لیے ایک بہت عمدہ ٹک لیا ہے۔ عجیب کا کٹ لگا س ہے — تمہارے ہونٹوں تک پہنچے گا تو ادر حسین ہو جائے گا۔“

”اچھا اب شاعری چھوڑ دہی —“ کوشلیا نے مسکرا کر چابیاں ڈیر بالڈ

سے لیتے ہوئے کہا — اور سوٹ کیس اٹھائے تھوڑا سا ایک طرف کو جھک کر وہ کٹیا کی طرف جانے لگی تو ڈیر بالڈ کھڑا اُس کو کھنکھائے ہوئے پتنگ کی طرح بجائے فضاؤں کے زمین پر ڈولتا ہوا دیکھتا رہا۔

کوشلیا نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کو ڈیر بالڈ کا اس طرح اپنی طرف دیکھتے رہنا اچھا سا لگا۔ اُس نے ادائے دلبری سے پکار کر کہا — جلد جلدی سے ہواؤ۔ ابھی تک نہیں کھڑے کیا نہ کھڑے ہو۔ اور ڈیر بالڈ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

مٹی کے تیل کا اسٹود جلا کر پہلے کوشلیا نے چائے کی کیتلی اُس پر رکھ دی۔ وہ گنگنا رہی تھی۔

ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دوسرا مصرعہ جو دراصل پہلا مصرعہ تھا اُسے اب بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے اپنا ایک معمولی سا کپڑوں کا جوڑا نکال کر رکھنے کے لیے ڈیر بالڈ کا سوٹ کیس کھولا۔ سوٹ کیس میں ڈیر بالڈ کا صرف ایک نارٹ سوٹ ایک شرٹ اور ایک پتلون تھا اور تو لیے میں کوئی چیز بڑی احتیاط سے لپیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے کھول کر دیکھا۔ ایک بہت ہی خوبصورت سا بگ تھا جو یقیناً بدیسی تھا۔ سوٹ کیس کی وہ پرس جس پر زپ لگی ہوئی تھی کچھ بھڑکی ہوئی سی تھی۔ کوشلیا نے زپ کھینچ کر وہ پلندہ نکالا جو اس میں محفوظ تھا۔ اُس میں

کوشلیا کے اپنے لکھے ہوئے خطوط تھے اور خطوط کے بیچ میں سو سو روپے کے کچی نوٹ تھے۔ کوشلیا نے انہیں گنا۔ پورے اکتالیس تھے۔ چار ہزار ایک سو روپے۔

اتنا بہت سا روپیہ اُس نے اپنے ساتھ کیوں رکھا۔؟ یہ بات ایک سوالیہ علامت بن کر اُس کے ذہن میں ابھری۔ اور ڈیر بالڈ نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔ چابیاں دے کر اُس نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ انہیں حفاظت سے رکھنا۔ وہ مجھ پر کتنا بھروسہ کر رہا ہے۔

ڈیر بالڈ کی یہی باتیں کوشلیا کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی تھیں۔ مجھ پر محققین اتنا اعتماد ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اُسے اس لمحہ وہ سب لوگ یاد آئے جو اُس سے محبت کی باتیں تو کرتے تھے لیکن سونے سے قبل اپنی جیب سے ایک ایک پیسہ نکال کر گن لیتے تھے۔ زندگی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈیر بالڈ ہی میرے لیے بہت کچھ ہے۔ ایسی تبدیل کے مانند جو اپنی کسی خرابی کی وجہ سے بھڑک تو اٹھتی ہے لیکن احتیاط سے بتی کو نیچے اُپر کر کے کوشلیا اُس کو راستہ دکھلانے کے قابل بنالینے کا گرجان گئی ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے اطراف اندھیروں اُجالوں کا ایک جال سا بن گیا ہے۔

— شانوجہ اُسے مایوس کن اندھیروں میں ڈھکیل رہا ہے اور ڈیر بالڈ اُس کو اُمید کی روشنی دکھا کر زندگی کی طرت کھینچ رہا ہے۔

چائے کا پانی کھونے لگا تو اُس نے اسٹوڈ کے شعلے کو کم کرنے کے لیے ہیسٹر سے
 تھوڑی سی ہوا نکال دی تاکہ ڈیر بالڈ کی واپسی پر تپتی ڈال کر چائے تیار ہو سکے پھر
 اُس نے نکلے ہوئے سارے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ دیئے اور اپنے خطوط اور
 نوٹوں کے پلندے کو اُسی جگہ پر رکھ کر سوٹ کیس کو مقفل کر دیا۔

کھڑکی سے جھانک کر اُس نے کا کا سب بڑھپنا چاہا کہ کیا وہ بھی چائے پیے گا
 لیکن کا کا جمہی کے پودے کے پاس نہ تھا۔ کو خدیا اس کھڑکی سے ہسٹ آئی
 اندر مشرق کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکی سے دیکھا تو کا کا تین مسافروں کو بجرے
 میں بٹھائے جھیل کی سیر کر رہا تھا۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک عورت تھی۔ عورت
 کی گودیں بچہ تھا۔ بچہ کی موجودگی نے شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی
 تھی۔ اُس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ ڈیر بالڈ اور پیارے لال کو پہلے پس
 جب اُس نے جھیل کی سیر کرائی تھی

تو اسی طرح دو

مرد تھے، ایک عورت اور ایک بچہ۔ کا کا اسی طرح بے نیاز اپنی ہی ذہن
 میں چپو چلا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس دن کو اپنی زندگی کے اچھے دنوں میں
 شمار کرنا چاہیئے یا بُرے دنوں میں۔ اس دن جہاں ڈیر بالڈ کی ہمدردیاں
 اُسے نصیب ہوئیں وہاں پیارے لال نے شان و جہ کو اُس سے چھین لیا۔

پیارے لال نہ آتا اور وہ دل دہلا دینے والا حادثہ اگر نہ ہوتا تو شاید

پیارے لال شانوجہ کو تیار ہی کے اُس راستے پر نہ لے جاسکتا جس کا ذکر ڈیر بالڈ نے اپنے حالیہ خط میں کیا ہے کہ پیارے لال برابر شانوجہ سے ملتا رہا ہے۔
 کچھ سوچ کر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دن اُس کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔
 قدموں کی چاپ سُن کر وہ پہچان گئی کہ ڈیر بالڈ آ رہا ہے۔ اس پر کبھی
 بھی اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس سے ملاقات کے پہلے دن کو
 اپنی زندگی کا منحوس ترین دن سمجھتی ہے۔ دل میں اُس نے ارادہ کر لیا کہ کئی
 کمزور لمحے میں بھی وہ ڈیر بالڈ سے کوئی بات نہیں کرے گی جس سے یقیناً اُس کا
 دل دُکھے گا۔

قریب ہو کر قدموں کی چاپ بجائے اس کے کہ زیادہ واضح اور نمایاں ہو جائی
 کچھ اور تھم پڑ گئی۔ — کوشلیا جان گئی کہ ڈیر بالڈ دبے پاؤں اُس کے قریب
 آ رہا ہے تاکہ اُس کو ان خیالوں سے چور کا کر نکال سکے جس میں وہ زنجیر ہو گئی
 ہے۔ — !

کسی نے پیچھے سے اُس کی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے دھک لیں اور پھر
 چٹا چٹ اُس کے گال چوم لیے۔ — ان ساری باتوں کی عادی ہونے
 کے باوجود اس کا بہرہ سُرخ ہو گیا۔ یہ سُرخ ڈیر بالڈ سے جذباتی لگاؤ کا
 صاف اظہار تھی۔

”چھوڑ بھی پہلے مجھے یہ بتاؤ تمہیں کمرہ مل گیا ہے یا نہیں۔“

"مل گیا ہے ہم دونوں ہی کو ایک ایک کر کے مل گیا ہے۔" — کوشلیا
 چونک ہی گئی — پلک جھپکنے میں اُس کی آنکھوں پر سے ہاتھوں کی
 گرفت ہٹ گئی تھی اور اُس نے دیکھ لیا تھا کہ شانوجہ سامنے کھڑا مسکرا
 رہا ہے — زہ بہت ہو کر رہ گئی۔

اس غیر متوقع حادثہ کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھی — ہر جذبے
 سے عاری خالی خالی نظروں سے وہ اُسے تنکیتی رہی۔ پھر اُس کا سر جکرا گیا۔
 آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا — آنکھیں بند کر کے وہ ہوا میں جھومتے
 ہوئے سر کی طرح دیکھتے دیکھتے جھوم کر رہ گئی — شانوجہ نے بڑھ کر
 اُسے سنبھالا۔ سہارا دے کر پلنگ کی بیٹی پر بٹھایا اور اُس کی بانہ پکڑ کر
 اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے ماں — دیکھ میں آ گیا ہوں۔"
 کوشلیا نے سنبھل کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ شانوجہ کو پلکیں
 جھپکا کر غور سے دیکھا۔ پھر یکا یک چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔
 شانوجہ کھاٹ کی بیٹی پر اُس کے قریب ہوا یا — "ماں!"
 وہ بھری ہوئی شیرینی کے مانند اٹھی — "ماں — مجھے ماں
 مت کہنا۔"

"میں تیری ماں نہیں ہوں — اچھا ہوتا اگر تو مرجاتا اور میں ماں

پکارے جانے کے لیے ترس ترس کر رہ جاتی — میں سوچتی تھی —
 میں نو سوچتی تھی کہ جب تو بڑا ہوگا تو مجھ سے کہے گا کہ کاش تم میری ماں
 نہ ہو تیں اور میں فخر سے سینہ تان کر چلوں گی کہ میں بہر حال تیری ماں ہوں
 تیرے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے — لیکن آج مجھ جیسی ماں مجھ سے کہہ رہی
 ہے کہ کاش تو میرا بیٹا نہ ہوتا — تو نے کبھی آئینے میں اپنا قد دیکھا ہے۔
 اپنے ہاتھ پیر دیکھے ہیں، اپنا سینہ دیکھا ہے — تجھے معلوم بھی ہے کہ
 ماں جب اپنے بیٹے کو عمر کی اس منزل میں دیکھتی ہے تو رعزت کی حد تک
 خود اعتمادی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے کو عام عورتوں سے بلند
 درجہ سمجھنے لگتی ہے۔ لیکن تو نے میری زندگی کو اٹھا کر کھائی کے اندھیروں
 میں پھینک دیا ہے۔ اس سے اچھا تو یہ ہوتا کہ خود مجھے پھینک دیتا کہ تجھے
 دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتی۔

شانوہ میں نے کیا کیا سوچ رکھا تھا — میں سوچتی تھی کہ تو شرم سے
 میرے سامنے بھی آنے سکے گا۔ تیرا کا کا تجھے بچڑ کر مجھ تک لائے گا۔ لیکن تو
 کس قدر سفاک ہے۔

تجھے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا بھی تو نہیں — لجا اور شرم کے لفظ
 تو نے شاید کبھی سنے ہی نہیں — تجھے آخر یہ کیا ہو گیا ہے شانوہ —
 تجھے آخر یہ سب کیا ہو گیا ہے، اور کوشیا نے پھر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

”ماں تو یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ لجا اور شرم کے لفظ میں نے سُنے ہیں۔
 — تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے۔ — بزدلے گیسٹ ہاؤس میں
 آج ہم دونوں کے کمرے اتفاق سے ایک دوسرے کے برابر برابر ہیں۔ ایک دیوار
 بیچ میں حائل ہے ماں۔ ایک کمرے میں پیارے لال کے ساتھ میں ٹھہرا ہوں اور
 دوسرے میں سعید زماں کے ساتھ تو رہے گی — میں اپنی شرم کی گھڑی اٹھا
 لاؤں گا تو اپنی بچا سمیٹ لا — رات گزر جائے تو صبح کو ہم ایک دوسرے
 کا چہرہ اُجھائے میں دیکھیں گے، پھر تو مجھے ایک بار صحت ایک بار بیٹا پکار
 لینا۔ اور مجھے بھی اتنی اجازت دینا کہ میں بھی تجھے صرف ایک بار ماں پکار لوں۔
 اور شانوجہ لوٹ گیا — آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر کوشلیا نے اُس کو
 باہر نکلتے ہوئے دیکھا — پھر کسی غیر ارادی قوت نے اُس کو سہارا دے کر
 اٹھایا — سحر زدہ عورت کی طرح وہ جیسے سرتے میں اُس کے پیچھے چلتی ہوئی
 کٹیا کے دروازے تک آئی — شانوجہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا احاطے
 کی ہری بھری باڑہ کے قریب پہنچ گیا تھا جس پر لال لال مجھے دار پھولوں
 کی سیلیں چڑھی ہوئی تھیں — کا کا بجرہ لے کر تینوں مسافروں کے ساتھ
 جھیل میں نکل گیا تھا اور کوشلیا باڑہ کے پرے شانوجہ کو غوردار ہوتا ہوا دیکھنے
 کے لئے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شانوجہ بھی پلٹ کر اُس کی
 طرف دیکھے۔ لیکن شانوجہ کا یہ سوال گونج رہا تھا۔

”تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے؟“

تو جانتی ہے کہ تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے؟ تو جانتی ہے کہ —

وہ دل ہی دل میں شانوجہ سے باتیں کرنے لگی — شانوجہ تو کتنا

سفاک ہے — کتنا دلیر اور کتنا ظالم — میں تو سمجھتی تھی کہ تو بتا ہی

کے راستوں پر چلی بڑنے کے باوجود وہی شانوجہ ہے جو رات گئے گھر لوٹتا ہے

تو پیر ویا کر چوروں کی طرح اپنے بستر تک آتا ہے اور چپکے سے پڑھتا ہے —

میں جاگتی بھی ہوں تو یوں ظاہر کرتی ہوں جیسے جاگ نہیں رہی ہوں — اور جب

یہاں کٹیا میں موجود ہی نہیں رہتی ہوں تو تجھے کتنا اطمینان ہوتا ہے — ہم

دونوں ہی ایک دوسرے سے ڈرتے رہے ہیں شانوجہ — اور میں آج کے اسی

لمحے سے خوف کھاتی رہی ہوں جو اب بظاہر گزر گیا ہے لیکن سچ پوچھو تو ایک

نشر بن کر میرے دل میں اتر گیا ہے۔

تو نے اتنی تلخ باتیں کہاں سے سیکھ لیں — اپنی اس ناپختہ عمر میں کیا تو

نے زندگی کا اتنا شعور حاصل کر لیا ہے جو تیری زبان سے ایسے جملے بھی کہہ سکتا

ہے کہ — ”رات گزر جائے تو صبح کہ ہم ایک دوسرے کا چہرہ اُجھائے میں دیکھیں گے

پھر تو مجھے ایک بار بیٹا پکار لینا اور مجھے بھی اجازت دینا کہ میں تجھے مان

پکار لوں۔“

ڈیر بالڈ اب تک نہیں آیا — وہ اُس کے لیے بے چین ہو گئی کہ وہ آئے تو اُس سے مزید تفصیلات کا علم ہو سکے — اُداس، مضحل اور تھکی ماری جب نہ کٹیائیں واپس ہونے لگی تو اس عارضی تازگی کو جو ڈیر بالڈ کا خطا پاکر اُس نے حاصل کی تھی شائوہ نے جیسے نوچ پھینکا تھا۔

کٹیا میں پہنچ کر اُس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ غارے اور کاجل کے کے لئے جلد سفید اور سیاہ دھبے اُس کے چہرے پر نمایاں تھے جو اُن آنسوؤں کی چغلی کھا رہے تھے جو وہ بہا چکی تھی۔

چائے کا پانی کھول کھول کر سُکھ گیا تھا — اُس نے کپڑے سے پڑاؤ ڈھکن نکالا اور گلاس بھر پانی کیتلی میں ڈال دیا — پانی کھلنے کی چھن چھن ہوئی اور مقوڑا سا دھواں کیتلی سے اُٹھا کہ کوشلیا نے ڈھکن ڈھک دیا۔

میرا حال اُس خالی کیتلی سے ملتا جلتا ہے جو اسد و پردہری بغیر پانی کے جل رہی تھی اور جو پانی میں نے دوسری بار ڈالا ہے وہ گویا ڈیر بالڈ کا خطا تھا جس نے مجھے تسکین دی تھی — لیکن اب شائوہ نے مجھے جس آگ میں پھینک دیا ہے وہ آگ تو شاید دوزخ کی آگ ہے جسے شاید ڈیر بالڈ بھی نہیں بجھا سکے گا۔

آج جھیل سے جتنے مسافر لوٹے تھے اُن کی اکثریت زرد نگاہوں سے محروم رہ گئی تھی۔ جوئے تھے اُنھوں نے محسوس بھی نہیں کیا۔ جو پہلے آچکے تھے اُنھوں نے کوشلیا کو بد چہرہ اس کے باوجود بھی کوشلیا کے ہاتھ سے گلاب لینے کے سوا اُن کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ بعضوں نے خاموشی اختیار کی اور اپنی بڑی براس طرح اثر چھوڑنے کی کوشش کی کہ اُنھوں نے کوشلیا کے نہ ہونے پر کوئی کمی ہی محسوس نہیں کی۔

کوشلیا نے متھ پانی سے جھگڑ کر صابن چہرے پر ملا ہی تھا کہ ڈیر بالڈ آدھکا اُس نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پکارا "کوش"۔ کوشلیا نے آنکھیں کھول کر اُس کو دیکھا اور پھر جھجک کر تل سے گرتے ہوئے پانی کو لبہی ہتھیلیوں کی دلدلوں میں بھر بھر کر چہرے پر اچھالنے لگی۔

"میں جس وقت آیا تھا تم بالکل تیار ہو چکی تھیں۔ میں شاید آج ہی تم سے ملا ہوں۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا۔"

اس مذاق کے باوجود کوشلیا مسکرا نہ سکی، اُس نے قویہ سے چہرے کو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"شانہ جہ آیا تھا۔ وہ ابھی ابھی گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں"۔ ڈیر بالڈ کہنے لگا۔ وہ لوٹتے ہوئے مجھ سے

راستے میں ملا تھا۔ میں نے پوچھا بھی۔ کہنے لگا۔ تم سے مل آیا ہوں۔

اُس کے چہرے پر میں نے کوئی ملامت نہیں دیکھی — وہ بالکل مطمئن تھا —
 — تمھاری طرح نہیں کہ شانوجہ نے تمھارے چہرے پر اتنے نقوش چھوڑے
 ہیں کہ پھر مجھ سے ملنے کے لیے تمھیں اپنا چہرہ دھونا پڑا — شانوجہ کو پہچانا
 مشکل ہو گیا ہے۔ عورتوں کے لباس میں تو وہ بظاہر بہت کچھ بدل جاتا ہو گا
 لیکن اب اُس کی وہ معصومیت مریچکی ہے جو سال ڈیڑھ سال پہلے گناہ کی چاؤ
 اوڑھے تمھارا سامنا کرنے سے اُسے روکتی تھی اور وہ پنجوں پر چل کر اپنے
 بستر تک پہنچتا تھا۔ آج جب وہ شانوجہ مجھ سے نہیں ملا کوش تو میں نے جانا
 لیا کہ تم زیادہ دنوں تک اُس کا پیچھا نہ کر سکو گی۔ وہ بہت دُور نکل گیا ہے اور
 تمھارا اُس تک پہنچنا اب مشکل ہے۔
 ”ٹھیک کہتے ہو۔“

”چلو چلیں باہر — سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤ گی — میں تو اس
 طرح سوچتا ہوں کوش کہ ہر خوشی کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی جہاں سے ملے
 جس وقت ملے حاصل کر لینا چاہیئے — ذاتی غم کوئی غم ہی نہیں ہوتا اس
 لیے کہ ہر غم کے ساتھ کسی دوسرے کی ذات بھی وابستہ ہوتی ہے جسے تم
 اپنے دل میں بسا کر اپنا لیتی ہو اور پھر اُس کا غم تمھارا ذاتی غم بنتا ہے۔ کسی
 کو اس کی اجازت ہی نہ دے کہ وہ تمھارے دل کے اس حد تک قریب آ سکے
 — شانوجہ تمھیں نہیں رو رہا ہے۔ تم شانوجہ کو رو رہی ہو — تم جب کبھی

کسی گھنے سائے کے نیچے سستانی ہو تو تم نے اُس پیڑ ہی سے اپنے جند باقی
رشتے قائم کر لیے ہیں جس نے تمہیں یہ سائے دیے تھے اور جب وارہ پیڑ
خزاں کے ہاتھوں جھلس گیا ہے تو تم اُس کی بے سرد سامانی پر افسوس بہانے کے
لیے چلتے چلتے ٹھہر گئی ہو اور جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوا — مسرتوں کا وہ
کارواں جو تمہارے ساتھ تھا تمہیں پیچھے چھوڑ کر نکل گیا ہے اور پھر بھونڈی
بھٹکی تم کبھی اس کارواں سے ملی ہو تو اُس نے تمہیں پہچاننے سے بھی انکار
کر دیا۔

”خیر چھوڑ دو بھی — چلو تیار ہو جاؤ آج میں بہت بیوں گی۔“

”ضرر نہ پیو۔“

کو شکلیا نے بہت دھیمی آواز میں آئینے کے سامنے سورتے ہوئے کہا۔
”ضرر نہ پیو — لیکن افسوس سمجھ کر نہیں — پنی کر اُداں ہو جانا حماقت ہے۔
پیسہ ضائع کر کے ہم اپنی زندگی کا ڈکھ درد کم نہیں کر سکتے اور نہ زیادہ کر لیتے ہیں
تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نے شراب سے بے وفائی کی ہے — اُس کے
ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا — اور یہ بدسلوکی تم نے اکثر روا رکھی ہے —
پنی کر عورت کو ایک گفٹہ پھول بن جانا چاہیئے۔ ایک خوشبو، ایک نغمہ، ایک
تبسم — لیکن پینے کے بعد اگر تم کسی پھول پر بھی غصہ کرتی ہو تو اُس کی
پنکھڑیوں کو نوچ کر پھینک نہیں دیتیں بلکہ اُس کو ہاتھ میں نسل کر رہن پڑتی ہو

”بس کر نہ ورنہ ابھی نہ پڑوں گی۔۔۔ اندر سن لو آج میں برزدے نہیں چلنے کی۔“

”کیوں نہیں چلو گی۔۔۔ میں آج جہاں چاہوں گا تم وہاں چلو گی۔۔۔ مجھے شانوجہ کے کمرے کے برابر ہی کمرہ ملا ہے جس میں وہ بلونت یعنی تمہارے پیارے لال کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔“

”جانتی ہوں۔“

”یہ بھی جانتی ہو؟“

”ہاں۔“

”تو یہ بات بھی تمہیں شانوجہ نے بتلائی!“

”ہاں۔“

”تو پھر اب اور کیا باقی رہ گیا ہے جو تم شانوجہ سے چاہتی ہو؟“

”کچھ نہیں چاہتی۔۔۔ کچھ بھی نہیں چاہتی۔۔۔ لیکن یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اپنی رسوائیوں کو دیکھ چکے کے بعد اب اپنی آنکھوں پر یہ ظلم بھی کر دے کہ وہ شانوجہ کی برادریاں دیکھیں۔ اپنے دل پر یہ ظلم کیوں کر دے کہ اُس کی اپنی دھڑکن کا پتہ ہی نہ ہو۔ اپنے احساسات کی بھٹی پر اس قدر تیل بھی کیوں ڈالوں کہ وہ منٹ بھر میں میری ہستی کو فلا کر خاکستر کر دے۔۔۔ تم لوگ آخر مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔۔۔ بتاؤ بلو؟“

”جذباقی ہو رہی ہو کوش — میں تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں جہاں
 تم بہر حال جاؤ گی۔ کیا تم کبھی بھی بروئے کار خ نہیں کر دگی جب تمہیں معلوم
 ہو گا کہ شانوجہ بھی وہاں ہے۔ تم یوں سمجھو کہ شانوجہ بھی بازار میں وہی
 دکان لگا کر بیٹھ رہا ہے جو تم نے سجا رکھی ہے۔ آنے والے خوشحال مسافروں
 کی اکثریت ابھی منھاری دکان ہی پر مطمئن ہوتی ہے۔ جو بچ رہے ہیں انہیں
 شانوجہ نہیں چھوڑتا۔ چند ایک ایسے ہوں گے جو شانوجہ ہی کے خواہاں ہوں
 گے۔ بہر حال یہ سب کچھ چلتا رہے گا اور شانوجہ ان ساری باتوں کے
 لیے تیار ہو چکا ہے۔ پیارے لال کہہ رہا تھا، لونڈا بہت تیز ہے۔ بلا ہے
 بلا۔ اچھی رتھیں گھسیٹ لیتا ہے۔ خانوں کے سردار تک میں نے ہی اُس کو
 پہنچایا۔ سردار اُس کا اس قدر گریز دیدہ ہوا ہے کہ پوچھو نہیں — اُس نے
 بہت کچھ اُسے دیا ہے۔ تحفے، تحائف الگ دیئے ہیں۔ لونڈے نے کہیں چھپا
 دیا ہے۔ مجھ سے بھی اُس نے بے لوثیہ رکھا۔ اب یہ ہر ماہ اُس کے پاس جایا
 کرے گا۔ ماہانہ دوسو روپے ہر صورت میں شانوجہ کو ملتے رہیں گے خواہ
 کسی ماہ خان سے اُس کی ملاقات نہ بھی ہو۔ ویسے خان اب یہاں بروئے
 بھی آیا کرے گا۔ ہاں شانوجہ نے مجھ تک کو نہیں چھوڑا۔ پیسے بٹور
 لئے اور میری وہ دستی گھڑی ہتھیلی جیو سسگل کی گئی تھی۔
 اُس نے اور بہت سی باتیں بتلائیں کوش۔ وہ کہنے لگا کہ لونڈا آج ہی

سے اپنے مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری اس عمر کی چاندنی کے دن مختصر ہیں اور یہ چٹکتی ہوئی چاندنی ماند پڑ جائے گی تو پھر کوئی چمکوری میری طرف نہیں اڑے گا۔ تم لوگ جو محبت، ہمدردی ساری عمر کی رفاقت اور جذبات کی بات کرتے ہو، میری اس عمر میں جو تمہارے کام کی نہیں ہوگی اپنی محبت، ہمدردی اور جذباتیت کو میرے پیٹ کا ایندھن بنا سکو گے؟

وہ کہتا ہے دکان کے ایک تنکے کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ خود دکان کے مالک کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو یہ تنکا اٹھا کر مفت دے دے۔ یہ عمل تجارت کے اصول کے خلاف ہو گا۔

ایک لمحہ رک کر اُس نے کہا۔

”پیارے لال کہہ رہا تھا کوشش کہ شانہ نے آج تک ایک دوسرے بھی کسی کو مفت نہیں دیا۔۔۔ وہ ہر لمحہ کا حساب چکالیتا ہے۔ سفاک اس قدر ہے کہ کسی دوسرے کے ساتھ ہو گا تو ایک نگاہ غلط انداز بھی ہم پھر نہ ڈالے گا۔ جو اُس کے ہو گئے ہیں وہ اس کے گردیدہ ہو گئے ہیں جس وقت وہ آپ کی ملکیت ہوتا ہے اُس وقت آپ سے راہبانہ عشق کرتا ہے۔ کچھ اس طرح آپ کی تسکین کا باعث ہوتا ہے کہ آپ اُس کو بھول نہیں سکتے۔ آپ کے ایک ایک پل کو خوشی اور مسرت عطا کر دیتا ہے۔ اس کی رفاقت میں بیتا ہوا ایک ایک لمحہ یاد کا جگنو بن کر اپنی تنہا اندھیری راتوں میں ساتھ ہو جاتا ہے۔

”بس کرو۔۔۔ پھر تم بھی اُسی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔“

زور بالڈ ہنس پڑا۔۔۔ ”اوہ۔۔۔ تم ایک ہی جست میں ماں سے عورت بن گئیں۔ میں تو اس کے پاس کبھی نہیں جاؤں گا کوئٹہ۔۔۔ لیکن تمہاری زندگی میں داخل ہونے والے کتنے ہی ایسے نکل آئیں گے جو تمہیں نہ پا کر شانوجہ کی طرف جائیں گے اور شانوجہ کو نہ پا کر تمہاری طرف آئیں گے اور تمہیں اس زندگی کو گوارہ کرنا ہو گا۔ اگر برو دے، فیروزے اندر جھیل کے ان مثلث میں تمہیں اپنی دکان چلائی ہے۔۔۔ تم اُس مشترک گاہک کو جو تمہاری اندر شانوجہ دونوں کی سیڑھیاں چڑھے گا کیا ٹھہ کر رہو گی۔۔۔ تمہارے اندر اُس کے درمیان کون سے جائز رشتے کی زیوار رہے گی۔ تم جو کام کر رہی ہو اُس کام کی بنیاد ہی اس تصور کے مٹ جانے سے شروع ہوتی ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات کی گٹھری کسی گدھے پر لا کر تم مسند کی داسی تو بن سکتی ہو اس لیے کہ دیرینہ ناگناہ چھپا لیتے ہیں اندر پھر انہیں دھوکا بھی دیتے ہیں۔۔۔ لیکن بازار میں بیٹھ کر تم سرے سے وہ سیڑھی اُکھاڑ پھینکنا چاہو جو ہر مسافر کو تم تک پہنچنے کا حق دیتی ہے تو تمہارا کاروبار چل چکا۔“

”میں کب چاہتی ہوں کہ یہ دکان چلتی رہے۔“

”یقیناً چاہتی ہو۔۔۔ مجھ سے ملنے کے بعد تمہاری اُمیدوں کے ٹٹماتے ہوئے دیے جن کی روشنی میں تم دُور تک میرے ساتھ چلی آئی

تھیں سب کے سب بچھ گئے ہیں۔ تم سمجھتی رہیں کہ میں تھیں اس طرح اپنا لوں گا کہ تم امید کے ان چراغوں کو میرے گھر کے گوشے گوشے میں سو سو جتن سے جلاتی رہو گی کہ سارے گھر میں تمھاری محبت کے اُجالے بکھر سکیں لیکن آہستہ آہستہ جب تم مایوس ہوتی گئیں تو تم نے مجھ سے اس ضمن میں استفسار کرنا بھی چھوڑ دیا۔ کبھی مجھے اپنے وعدے بھی یاد نہیں دلائے کہ میں نے تھیں تمھاری اپنی دانست میں کتنا اونچا اٹھالینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ آخر تم اس جال سے نکل آئیں جس کو تم نے میری خاطر اپنے اطراف بٹن رکھا تھا اور پھر ہر آنے جانے مسافر سے ملنے لگیں۔ اور اس کے بعد تھیں اپنی دوکان کو پھر سے چلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

”سو تو میں چلا رہی ہوں۔“

”لیکن پٹ بھڑک کر۔۔۔ چوروں کی طرح۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

”مٹاؤ جبرین جاؤ۔“

”یعنی؟“

”یعنی گناہ اس طرح کرو جیسے تمھارا حق ہے۔“

کر خلیانے اپنے جوڑے سے گلاب کا ایک پھول نکال لیا اور خیا لوں میں گم اُس کی پکھڑیاں نوچنے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”سوچ رہی ہوں اپنی زندگی کے ساتھ یہی سادک کردن جو اس پھول سے

کر رہی ہوں تو بھی کیا بُرا ہے۔“

”کر سکی گئی؟“

”کیا معلوم؟“

”اور اگر کر سکیں بھی تو کسی کا کیا ہو گا۔“

”کچھ نہیں۔“

”پھر اس سے حاصل؟“

”مجھے یہ دیکھنا نہیں ہے۔“

”تو پھر اٹھو۔ برودے چلتے ہیں۔ آج رات وہیں گزار کر تم صحیح فیصلہ

لے سکتی ہو۔ جس زندگی سے تم بھاگ رہی ہو وہی زندگی مختار اچھا کر رہی ہے۔

لیکن تم بہت جلد تھک جاؤ گی اس لئے کہ تم میں بھاگنے کا یا رابھی تو

نہیں ہے۔“

اُس نے جوڑے میں پھنسل کر برابر کیے اور بڑی بے دلی سے خود کو ایسے میں

میں دیکھا۔ جب وہ تیار ہو کر ڈیر بالڈ کی طرف ساتھ چلنے کے لئے پلٹی تو وہ ہنس

رہا تھا۔

”اب کیا کوئی نئی بات کرنے والے ہو؟“

”ہاں۔“

”پھر کہہ بھی۔“

”خوش ہوں کہ تمہیں اپنے محسن کا، اپنی کشش کا، اپنی مہربانی کا شدید احساس

ہے۔“

”یہ کس طرح تمہارے دماغ میں آیا۔“

”اس لیے کہ جب تم زندگی سے انکار کرتی ہو تو آئینے میں اپنا عکس تک نظر

بھر کر نہیں دیکھ پاتیں۔“

”کیوں نہیں دیکھ پاتی؟“

”اس لیے کہ تم زندگی سے پیار کرنے لگو گی۔“

”کوشیا ہنس پڑی۔ ڈیر بالڈ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ کی پشت پر برس

دیا پھر ہاتھ ہاتھ میں لے کر دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

”تمہارا سوٹ کیس ساتھ رکھ لوں؟“ کوشیا نے جیسے چونک کر کہا۔

”کیوں کیا یہاں محفوظ نہیں رہے گا؟“

”پھر بھی احتیاط مناسب ہے۔ اتنی ساری رقم ساتھ رکھتے ہو، چابیاں

میرے حوالے کر دیتے ہو اور مجھے بتلاتے ہو کہ تمہیں سوٹ کیس میں اتنی بڑی

رقم ہے۔ اگر میں چابیاں ادھر ادھر ڈال دوں۔ سوٹ کیس ہی کھل چھوڑ کر

بھول جاؤں۔ کوشیا یہ کہتے کہتے پھر ڈیر بالڈ کی بیوی بن گئی تھی۔

اب ڈیر بالڈ کی معیت میں اُس نے پھر اپنا گھر تعمیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک چاہنے والی بیوی، ایک مشفق ماں اُس کے اندر انگریزانی لے رہی تھی۔ ڈیر بالڈ نے اُس کو بغور دیکھا — وہ جانتا تھا کہ کوشلیا اب کیسا بن گئی ہے۔

”رہنم یہیں محفوظ کر سکو تو بہتر ہے“ — ڈیر بالڈ نے کہا۔
 ”تو پھر چلو یہیں رکھ دیتی ہوں“ — ڈیر بالڈ نے نوٹوں کا ڈوری میں بندھا ہوا پلندہ نکال کر کوشلیا کے حوالے کیا۔

میرے ساتھ آؤ — کوشلیا نے ڈیر بالڈ کا ہاتھ تھام کر اُس کو اپنے سونے کے کمرے میں گھسیٹا — جس کی آدھی سے زیادہ دیواریں اینٹ اور گارے کی تھیں اور جس کا بھپر زیادہ دبیز معلوم ہوتا تھا — اپنے پلنگ کے نیچے سے ایک بھاری بھر کم صندوق کو گھسیٹ کر اُس نے باہر نکالا۔
 — پھونک مار کر گرد جھاڑی اور ڈیر بالڈ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”دیکھو یہ ہے میری تجوری — بس یہاں اس سے زیادہ محفوظ مقام کوئی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے رکھ دو۔“ ڈیر بالڈ نے اطمینان سے کہا۔

کوشلیا نے صندوق کھولا اور نوٹوں کا پلندہ احتیاط سے ایک کونے میں رکھ کر صندوق کو متفصل کرتے ہوئے کہا۔ نوٹوں کے ساتھ کچھ اور کاغذات

بھی تو ہیں۔

دراصل کو شلیا اپنے خطیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھی۔ ڈیر بالڈ سمجھ گیا وہ کہنے لگا۔ ”وہ بھی نوٹ ہیں اور وہی نوٹ میری محبت کی دنیا میں چلتے ہیں جب کہ مارکٹ میں اُن کا چیلن نہیں اور وہی نوٹ مجھ کو بہت پیارے ہیں۔“

”سچ کہتے ہو کہ وہ نوٹ تمہیں اتنے پیارے ہیں۔“

ڈیر بالڈ کو شلیا کی کمزوری جانتا تھا۔ ”تم چاہو تو اسے جھوٹ بھی سمجھ سکتی ہو۔ یہ تمہارا معاملہ ہے۔“

کو شلیا نے بڑے پیار سے ڈیر بالڈ کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اُس کو یقین دلایا کہ وہ اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں کرتی ہے۔

کرہ متفصل کر کے جب دونوں باہر نکلے تو کا کا بھرے کوئٹہ سے لگا چکا تھا۔ شام کا دھندلا ماحول جھیل میں زور تک پھیلی ہوئی سیال چاندی پر کا جل بن کر گر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں اس کا جل کی تختیں جھیل کے پانی پر جم جائیں گی لیکن آسمان پر ٹمٹماتے درجہ چار تارے اس بات کی غمنازی کر رہے تھے کہ کالی کالی مات جب جوان ہو کر فیوزے برودے اور جھیل کے مثلث پر چھا جائے گی تو وہ بھی اپنی چھپی ہوئی بے شمار فوج لے کر دیکھتے دیکھتے جھیل میں اتر جائیں گے۔

کا کا قریب آ گیا تو کوشیا نے اُس کو گرم کوٹ پہننے کی تاکید کی جو کبھی ڈیر بالڈ نے اُسے بطور تحفہ دیا تھا اور ڈیر بالڈ نے سگٹ اپنے ہاتھوں سے کا کا کے ہونٹوں میں لگا کر لاسٹر سے جلا یا اور دونوں ہاتھ ہلا کر روانہ ہو گئے۔ کا کا نے جواب میں مکر اہٹ بکھیر دی اور کوشیا کو مطمئن دیکھ کر اُس نے خوشی محسوس کی۔

”تم بتا سکتی ہو کہ یہ برودے کس زبان کا لفظ ہے اور اُس کا کیا مفہوم ہے؟“ ڈیر بالڈ نے کوشیا سے پوچھا وہ احاطے کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر چل رہے تھے۔

کوشیا نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”بس میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ یہ گسٹ ہاؤس کا نام ہے۔ اس سے زیادہ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“

”لیکن میں تمہیں بتاؤں تو یقیناً تم ہنس پڑو گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ عام بول چال میں بعض الفاظ مختصر ہو کر کتنے خوبصورت بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن پہلے میں چاہتا ہوں کہ تمہاری ذہانت کا امتحان لے لوں۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے دو منٹ دیتا ہوں۔ اگر تم بتلاؤ تو برودے پہنچتے ہی تمہیں انعام دوں گا اور وہ ایسی چیز ہو گی کہ تم یقیناً خوش ہو جاؤ گی اور جو نہ بتلا سکو تو تمہیں کڑی سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔“

”اور جو میں بغیر کچھ سوچے سزا ہی بھگتنے کو تیار ہو جاؤں تو؟“
 ”تو پھر میں تمہیں پہلے سزا دوں گا پھر انعام دوں گا۔“
 ”چلو میں ہارانتی ہوں اس طرح مجھے دو توں ہی ملیں گے، سزا بھی
 اور انعام بھی۔“
 ”تو ہار مان لی؟“

”ہاں — زندگی میں ایک اند ہار کبھی۔“

برودے انگریزی کے *Broad Lake* ”براڈ لیک کی بگڑی
 ہوئی صورت ہے۔ بول چال میں یہ برودے ہو کر مختصر بھی ہو گیا ہے اور
 خوبصورت بھی جیسے تم کو شلیا سے کوش ہو کر زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہو۔
 کو شلیا نے تعجب کا اظہار کیا لیکن یہ معلوم کر کے کہ برودے کی اصلیت
 کیا ہے اُسے خوشی ہوئی۔ ڈیر بالڈ نے اس کے اشتیاق کو بڑھانے کے لیے کہا
 تھا کہ جب وہ کو شلیا کو سزا دے گا تو اُس کو برودے کی نسبت مزید معلوم
 بہم پہنچائے گا۔

ڈیر بالڈ اور کو شلیا چلتے ہوئے اب جس ترابے پر پہنچے تھے وہاں سے
 فیوزے صاف دکھائی دیتا تھا — اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ فیوزے
 کی جگہ گاتی روشنیوں میں کتنے غم آتشیاں میں ڈھل کر نکھر رہے ہیں۔
 کتنی جھوٹی سچی محبتیں وداع بھی ہو رہی ہیں مستقبل کے لیے وعدے و وعید

بھی کر رہی ہیں۔

فیوزے میں دیس دیس کے مسافر جمع ہوتے تھے۔ دیس دیس کا غم اور دیس دیس کی خوشی سینوں میں بند ہو کر یہاں آتی تھی۔ یہاں فیوزے میں ہم نے جہاں سسکیاں سنی ہیں قہقہے لکھی ساتھ ساتھ مسنے ہیں۔ غموں اور خوشیوں کے ان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے انسانی جذباتوں کا نہ کوئی رنگ ہے نہ کوئی نسل اور نہ کوئی دیس۔

”فیوزے اپنی طرف کھینچتا تو ہے“ — ڈیر بالڈ نے کہا۔

”ایسا بھی نہیں ہے۔ تم زیادتی کر رہی ہو۔ فیوزے کا قصور بسن کو جُدا کر کے اُسی طرح نہیں کیا جاسکتا جیسے شانوجہ کو جُدا کر کے آج بھی تمھارا قصور ممکن نہیں ہے۔ فیوزے تو شانوجہ سے زیادہ وفادار ہے۔“
برودے کی جانب گھومتے ہوئے ڈیر بالڈ اور کوشلیا نے فیوزے کو،

کھڑکیوں اور روشندانوں سے چھنتی ہوئی جگمگاہٹ پر آخری نظر ڈالی۔ پھر اُن کی پشت فیوزے کی طرف ہو گئی اور درختوں کا وہ جھنڈ راستے کے آخری بجلی کے کھمبے کے پاس ہی نظر آنے لگا جہاں سے چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اور جہاں راستہ بالکھا کر ڈورا ڈورا سہما سہما گھنے درختوں کے اُن تاریک سائوں میں داخل ہو جاتا تھا اور کھائی کے قریب پہنچتے پہنچتے دم سادھے اس طرح لیٹ رہتا تھا کہ کسی بھی مسافر کے تلوے کو گد گدانے کی بھی اس میں ہمت

مہ بہتی تھی۔

”راستی ڈیرا برا لگتا ہے کہ کھائی کے قریب ان گھنے سائوں میں سے گزرنے کے لیے راستے پر جبر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آخری بجلی کے کھبے تک پہنچ کر، دیکھو راستہ کتنا اُداس ہو گیا ہے۔ گویا اس کے بس میں ہوتا کیرے کی فلم کی طرح ایک سہرا چھوڑتے ہی بل کھا کر فیروزے تک سمٹ آتا۔

”سچ کہتی ہو لیکن راستہ بہر حال راستہ ہے اور تمہیں اپنی بقیہ زندگی میں

اس راستے ہی کا تحمل سیکھنا چاہیے۔“

یہ ایک سڑک کے اسی آخری بجلی کے کھبے کے پاس جہاں اُجالا بھی مجبوراً معلوم ہوتا تھا تیز ریشمیاں رقص کرنے لگیں۔ یہ یقیناً کوئی فرائڈ بھرتی ہوئی موٹر تھی جس کی ریشمیاں قطار اندر قطار گھنے سایہ دار درختوں کے درمیان تیزی سے لپک کر راستہ ناپ رہی تھیں۔

بجلی کے کھبے تک پہنچتے پہنچتے جب موٹر سڑک پر گھوم کر کوشلیا اور ڈیر بالڈ کی جانب پلٹ گئی تو ساری سڑک اُن کی آنکھوں کے آگے منور ہو گئی۔ چھکا چھک ایک پودے کے پاس ہی وہ بیرے چمک اُٹھے۔ پھر جگمگاتے بیرے چار ہو گئے اور کوشلیا اور ڈیر بالڈ نے دوزخ گودشوں کو روشنی میں مگن دیکھا۔ پھر اُن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ سڑک پر ایک کونے میں ہٹ آئے۔

شاید یہ شانوجہ کا موڑ ہو — خانوں کے سردار کا یہ موڑ صرف سردا
ہی کی سواری میں رہتا ہے لیکن شانوجہ سے کہہ کر بلونت نے اسے رات بھر
کے لیے حاصل کیا ہو گا۔

”بلونت کون ہے؟“

”معاف کرنا — وہی تمہارا پیارے لال“

”اوہ ہاں — میں بھول گئی تھی“

موڑ قریب آیا اور بڑیک لگنے کی آواز ہوئی — پھر جیسے ہوائی جہاز
فضائوں سے اتر کر زمین پر جھول رہا تھا۔

چھک سے موڑ کا اندر زنی جھٹہ منور ہو گیا — کوشلیا نے دیکھا۔ پیارے
لال اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بڑے تمکنت سے بیٹھا تھا اور پاپ اس کے دائر
میں زنی خوشبو دار دھواں پھینک رہا تھا —

”میں تمہارے موڑ کو زنی ہی سے پہچان گیا تھا —“ ڈیر بالڈ نے پیارے
لال سے کہا جو دونوں ہاتھ جوڑ کر کوشلیا کو بدنام کر رہا تھا۔
لیکن کوشلیا نے منہ پھیر لیا۔

پیارے لال کوشلیا کی خفگی پر مسکرایا۔

”شانوجہ کہاں ہے؟“ ڈیر بالڈ نے سوال کیا۔

”وہ بروئے پر میرے انتظار میں آئیے کے آگے بیٹھا سو رہا ہو گا۔“

— یہ کہہ کر پیارے لال نے کتکھیدوں سے کوشلیا کو دیکھا جو نظر میں جھپکائے
سڑک کی تیک رہی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ — پیارے لال نے ڈیر بالڈ سے پوچھا۔
”برزدے۔“

”تو پھر آجاؤ۔“ میں ابھی نیرزے سے کھانے کی کچھ چیزیں لے کر برزدے
لوڑی گا۔ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ منزل ایک ہی بد تو راستہ چلنے میں
پس و پیش کیوں کریں۔ ازراں نے بیچھے کی طرٹ جھک کر کار کا پھل دروازہ
کھول دیا۔

”چلو کوش۔“ ڈیر بالڈ نے کوشیا کی ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا۔
”نہیں۔“ کوشلیا نے ہاتھ پکڑ کر اپنی ناراضگی کا کھلا اظہار کیا۔
”چلو بھئی۔“ ڈیر بالڈ نے پککارا۔

”نہیں نہیں۔“ میں کہہ چکی ہوں۔“ کوشلیا پرے ہٹ گئی۔
”دیکھئے بھئی۔ آپ بے سبب مجھ سے خفا ہیں۔“ پیارے لال
بڑی زحی سے کوشلیا سے مخاطب ہوا لیکن کوشلیا نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔
”اچھا بلونت تم چلیے بھئی۔“ ٹاٹا۔“ ازراں ڈیر بالڈ ہاتھ ملا کر بڑھ
گیا۔ کوشلیا نہ چار قدم آگے ہی نکل چکی تھی۔
”میں جانتی ہوں تم پھر دلیلوں سے کام لو گے لیکن میں اب کسی بحث کے

موڑ میں نہیں ہوں۔ میں چاہوں گی کہ تم اتنی دیر خاموش رہو جب تک کہ میں خود کچھ نہ کہوں۔“

ڈیر بالڈ خاموش ہو رہا۔ اُس نے جواب بھی نہیں دیا اور دونوں اس طرح راستے پر چلتے رہے جیسے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں لیکن چاہتے ہوں کہ بات کریں۔

”میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کی میرٹ پر بہت دیر تک خاموش رہ کر اظہارِ تعزیت کر چکے ہیں۔“ ڈیر بالڈ نے یہ بات اُس وقت کی جبکہ سڑک بل کھا کر درختوں کے تاریک سایوں میں داخل ہو رہی تھی اور کچھ ہی دُور پہ وہ اُس کھائی کے پاس سے گزرنے والے تھے جس میں کئی دن سے کوشلیا نے کوئی گلاب نہیں پھینکا تھا۔

لیکن کوشلیا اب بھی خاموش رہی۔

”میں چاہتا ہوں کہ اس بار کھائی میں گلاب ضرور پھینکتا چلوں۔“

کوشلیا نے اب بھی کچھ نہ کہا۔

ڈیر بالڈ بھی کچھ دیر کے لیے چُپ ہو رہا۔ لیکن جب وہ کھائی کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اُس نے ہانہ پڑھ کر کوشلیا کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”تم آخر مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہو۔“

کوشیا نے اُس کے سینہ پر سر رکھ دیا تو ڈیر بالڈ نے اپنی قمیض پر افسوس کی
نئی محسوس کی۔

”میں جانتا ہوں کوش تم بہت دکھی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری
اس زندگی میں اگر میں شامل نہ ہوتا تو شاید تم خودکشی کر لیتیں۔ لیکن تمہارے
بس میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ موت نہ زندگی۔ صرف افسوس تو
زندگی کی کوئی پونجی نہ ہوئے اور اگر اُن کو بھی تم بے دریغ لٹا دو گی تو پھر تم
ہی بتاؤ رہ ہی کیا جائے گا۔ کچھ تو رکھو کوش۔ اپنے لیے کچھ تو بچا کر
رکھ لو جان۔“

ڈیر بالڈ نے یہ بات کچھ اس درد سے کی کہ کوشیا نے مسکرا کر افسوس
بلو بچھ لیے۔ اور اپنے جوڑے میں ٹٹکے ہوئے گلابوں میں سے دو گلاب نکال
کر اُس نے ڈیر بالڈ کے ہاتھ میں اس طرح رکھ دیے جیسے زندگی بھر کی پونجی
سونپ رہی ہو۔

ڈیر بالڈ نے ان پھولوں کو چومنا اور ہاتھ بڑھا کر کھائی میں پھینک دیا۔
بروزے گسٹ ہاؤس کی چڑھائی شروع ہو چکی تھی اور دونوں ایک
دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آگے چل پڑے تھے۔ کوشیا بہت تھک گئی
تھی۔ ڈیر بالڈ نے کہا۔ ”کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں ہی تھک
گئے ہیں۔ میں نے کبھی کبھی یوں بھی سوچا ہے کوش۔ لیکن آج تمہارے

سامنے اعتراف کر لینے سے دل کا بوجھ اُتر گیا ہے۔ سوچتا ہوں تمھاری
محبت نہ ملتی تو میں کیسے جی پاتا۔“

چھپے سے آتی ہوئی کار نے راستہ کو منور کر دیا تھا۔ اس روشنی سے
فائدہ اٹھا کر کوشلیا نے ڈیر بالڈ کی آنکھوں میں جھانکا تو اُس کو ان آنکھوں
میں پیار کے گھٹنے سائے نظر آئے جو کڑی دھڑپ میں پناہ بھی دے سکتے تھے۔
اندھ گھپ اندھیروں میں روشنی بن کر راستہ بھی سمجھا سکتے تھے۔
پیارے لال کا موٹر فرائٹے بھرتا ہوا قریب آ کر رُک گیا۔

کوئی خدمت؟ — پیارے لال نے بظاہر ڈیر بالڈ سے پوچھا لیکن وہ
کوشلیا کو تاک رہا تھا۔

”یہی کہ تم جاسکتے ہو“ — ڈیر بالڈ نے رکھائی سے کہا۔
موٹر کھڑے کھڑے جھول گیا — پھر فرائٹے بھرتا نظروں سے اوجھل
ہو گیا۔

”اس طرح بھی کوئی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے؟“ — ڈیر بالڈ نے
اپنی ہی سرچ میں گم اس طرح اپنے آپ سے کہا جیسے کوشلیا سے کہہ رہا ہے۔
”واقعی موٹر بڑی سفاک سوا رہا ہے۔ جانے والے کو منٹ بھر میں
جد کر دیتی ہے۔“

میں بھی کبھی تمھاری زندگی سے اسی طرح گزر جاؤں تو؟“

”گزر سکو گے؟“

”مشکل ضرور ہے۔ لیکن شاید ناممکن نہیں۔“

کوئٹا ہنس پڑی۔ جھوٹ بول کر دھونس جھاتے ہو — میں تو یہ کہتی ہوں کہ بہت آسان ہوتے ہوئے بھی تمہارے لیے اب ممکن نہیں۔“

ٹیر بالڈ نے کوئٹا کے ہنستے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔
چڑھائی ختم کر کے جب وہ برزدلے کے احاطے میں پہنچے تو ڈیر بالڈ نے
کوئٹا کا ہاتھ تھام لیا — میرے ساتھ بائیں اندر چلو۔ اب کی ہمیں کمرہ بہت
اچھا ملا ہے — برودلے کے احاطے میں ہوتے ہوئے بھی جیسے برزدلے سے
الگ ہو۔

چلتے چلتے کوئٹا نے برودلے کے احاطہ پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی —
پھولوں کے زرخیزوں میں چھوٹے چھوٹے بجلی کے قمقمے پیارے سے لگ رہے تھے۔
رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے بیدار پلاسٹک سے بنی ہوئی رنگارنگ گول
گول، کرسیاں بکھری ہوئی بھٹی لگ رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ شاید اپنے اپنے
کمرے ہی میں تھے کیونکہ کمرے کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور تھپتھپ رہنویں
کو لے کر اڑ رہے تھے۔ اس خوبصورت سے احاطے میں کچھ لوگ ادھر ادھر
چھتریوں کے نیچے بکھرے ہوئے تھے — رات خنک اور سرد تھی اس لیے
برودلے کا احاطہ پراسرار خاموشیوں میں گھرا ہوا تھا۔

جو لوگ احاطے میں بیٹھے تھے وہ بڑی سنجیدگی سے جانے کن کن مسائل پر باتیں کر رہے تھے۔

بروزے کی عمارت روشنیوں اور قمقموں سے جگمگاتی رہی تھی۔ احاطہ خاموش تھا۔ اس تضاد کی، جو پہلو پہلو دیکھے جاسکتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے بروزے کی عمارت کی تیز روشنیوں اور منہگام آرائیوں سے فرار چاہا تھا، چھتریوں کے نیچے مدھم اور رنگین روشنیوں کے گوشوں میں مصروفِ راز دنیا ز تھے۔

زدا سا ٹھٹھک کر کوشلیا نے ڈیر بالڈ کا ہاتھ دبایا۔

”وہ اس کونے میں کون ہیں؟“

ڈیر بالڈ نے بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”وہ لوگ نہیں ہیں جن کی تمھاری نظروں کو تلاش ہے۔ شانوجہ اور بلونت تو یقیناً اپنے کمرے میں بیٹھے رہے ہوں گے۔“

”کیا وہ بہت پینے لگا ہے؟“

”نہیں، کچھ ایسا زیادہ تو نہیں، بس ضرورتاً پی لیتا ہے۔“

کوشلیا خاموش ہو گئی۔

جب وہ اور ڈیر بالڈ کمرے میں داخل ہونے کے لیے برآمدے کی سیڑھیاں طے کر چکے تو انھوں نے دیکھا کہ برابر کے کمرے کے باہر ایک خوبصورت سی

لڑکی اکیسی بیٹھی اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے میز پر دو گلاس رکھے ہوئے تھے جو شاہد ہسکی، برانڈی یا رُم سے کچھ ہی دیر پہلے بھرے گئے تھے لیکن اس وقت ان گلاسوں میں نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ لڑکی کے مقابلہ والی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ اس قدر گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اُس کو کوشلیا اور ڈیر بالڈ کی آمد کا پتہ تک نہ چل سکا۔ ڈیر بالڈ نے اس لڑکی کو پہچان لیا۔ سوٹ کیس رکھ کر اُس نے اپنے کمرے کا تالا کھولا اور کوشلیا اور وہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ سوچ اُن کر کے اُس نے لاسٹ کھول دی تو کوشلیا نے کرسی پر نیم ڈرا نہ ہوتے ہوئے کہا۔

”جلدی سے سُرٹ کیس کھول کر دہسکی نکالو، مجھے بڑی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“

ڈیر بالڈ نے سُرٹ کیس میز پر رکھ کر کھیل دیا۔ بلجیم کٹ گلاس کا خوبصورت مگ نکال کر اُس نے بڑے ادب سے جھک کر کوشلیا کی خدمت میں پیش کیا تو اُس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

”لیکن ڈیر میری بیڑ کا تم نے کیا کیا؟ اس مگ میں تو دہسکی نہیں مجھے اپنی چھیتی بیڑ پینی چاہیے۔“

”فیوزے سے میں نے بیڑ کے باٹل لے لیے ہیں اور پانی بھرے ٹب میں

ڈال دیے ہیں۔ کمرہ محفوظ کرنے سے پہلے ہی میں نے بیر کا انتظام کر لیا تھا۔
 ”میں تمہاری ان نوازشوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔“

”صرف مسکرا کر زبان سے کچھ کہے بغیر۔۔۔ کیونکہ شکریہ کے لفظ سے ہم
 ایک دوسرے کو اجنبی سے لگنے لگتے ہیں اور آج تم خلافت معمول میرا بارِ شکر
 ادا کر رہی ہو۔۔۔ نوازش، عنایت، کرم، مہربانی، ان الفاظ کے استعمال
 سے تم میرے پاس ہو کر بھی کتنی دُور معلوم ہوتی ہو۔“

مگ کو بیر سے بھر کر ڈیر بالڈ نے دھسکی کی بوتل کھولی اور گلاس میں ڈالتے
 ہوئے اُس نے کوشلیا کو سر ڈالانے کے لیے کہا۔

ڈیر بالڈ کے گلاس میں سر ڈاڑھالتے ہوئے کوشلیا نے پوچھا۔

”شانوہ کا کمرہ کہاں ہے، کیا وہ لوگ اس وقت کمرے پر نہیں ہیں؟“
 ”ابھی ابھی تم شانوہ کو دیکھ چکی ہو۔۔۔ لیکن اُس نے تمہیں نہیں دیکھا۔“
 ”کیا۔۔۔ کیا وہ خوبصورت سی لڑکی۔۔۔ وہ۔۔۔ دی؟“

”ہاں۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم دیکھتے ہی پہچان لو گی۔۔۔ لیکن
 جب میں نے دیکھا کہ تم نے اُس کو بغور نہیں دیکھا ہے تو خاموش ہو رہا۔“
 ”لیکن وہ شاید تمہارے متعلق ہی سوچ رہا ہو گا۔“ کچھ دیر خاموش
 رہ کر ڈیر بالڈ نے اس طرح بات پوری کی۔

کوشلیا بلجیم کٹ گلاس کے حسین مگ میں جھانک کر بیر میں اپنا عکس

دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور ختم کر کے شیشے کا ٹمنہ احتیاط سے مگ میں جھکا دیا اور خانی مگ میں بیر کی سطح اور نیچی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بھر گیا۔

”تم نے مجھے یہاں لا کر اچھا نہیں کیا۔“ کو شلیا نے بڑے بھتیاز کے ساتھ اس جملے کو ادا کیا۔

’ڈیر بالڈ‘ جس نے دھسکی کا نگاس ابھی ابھی میز پر رکھا تھا ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کچھ دیر بعد تم کہو گی کہ میں نے کچھ ایسا برا بھی نہیں کیا۔“
 ”تمھاری باتوں اور تمھاری دلیلوں کے چکر میں پڑ کر جانے میں کیا کیا مان لیتی ہوں۔ لیکن یہ جو سینے پر ایک پتھر سا دھرا ہے اُس کو ہٹا سکوں گی؟“
 ”ہٹا سکتی ہو بشرطیکہ تم اچھائی اور بُرائی کے تضاد ہی کو ذہن سے ختم کر دو۔“

”نہیں کر سکتی۔ جس عورت نے ہر سانس میں کر بے محسوس کیا ہے اور ہر گھنے سائے کے نیچے یہ جان کر رکتی رہی ہے کہ اُسے آگے جانا نہیں ہے وہ ابھی اتنی سفاک نہیں ہو سکتی۔“

”پھر وہ پتھر جو تمھارے سینے پر دھرا ہے دھرا رہے گا۔“

”جانتی ہوں۔ رہ سکتا ہے۔“

”لیکن جب تک یہ پتھر بٹے گا نہیں تم شانوجہ کو کس طرح اپنا سکو گی۔“
 ”شانوجہ کو اپنانے کا اب کوئی سہاں ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”بکو اس کرتی ہو۔۔۔ وہ ممتھارا زادہ سا لہتی ہے جان جسے تم نہیں
 چھوڑ سکتیں، نہ تمہیں چھوڑ دے تب بھی تم سے اس کی جُدائی ممکن نہ ہو گی۔“
 ”اگر یوں ہو بھی تو کیا فرق پڑے گا۔ یہی ناکہ مجھے اپنی مجبوریوں سے
 پھر ایک بار سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ شانوجہ کا باپ لپکتے ہوئے کوئٹہ کی طرح
 میری زندگی میں داخل ہوا اور میری رُوح کو جلا کر اتنی تیزی سے نکل گیا کہ
 میں اُسے پکڑ بھی نہ سکی۔ پھر کتنے ہی سراپوں کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے
 ریت کے گھر وندے بنائے لیکن نہ پانی کی بوند ملی نہ یہ گھر وندے رہ سکے۔
 زندگی کے اس چٹیل اور تپتے ہوئے میدان میں تم لے تو میں نے سوچا کہ یہ
 بادل اُڑاؤ کر چھایا ہے بنا بوم سے چھٹے گا نہیں اور میں اس ننھے سے پودے
 کی جو کہ دتھناق و دوق صحرایں سر اٹھائے کھڑا ہے اب بڑے چین سے آبیاری
 کروں گی۔ لیکن تم ایک ایسے بادل تھے جو نہ کھلتے تھے نہ رستے تھے
 اس کے باوجود میں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے پھر یہ سوچ کر بیٹھ رہی کہ چلو
 کچھ نہ سہی تم نے خواب تو دیسے ہیں ورنہ جاگتی آنکھوں کو یہ بھی کہاں میسر
 آتے ہیں۔۔۔ شانوجہ نے لیکن ان خوابوں کی بھی دھیالیں بکھیر دیں۔“
 ”تم چاہو تو ان دھیوں کو سمیٹ سکتی ہو۔ بکھرنے والے خواب پھر

تھاری آنکھوں میں نیند بن کر سما سکتے ہیں۔ — صرف اپنے سوچنے کے انداز بدل دو۔"

"میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا۔ سوچ سوچ کر ہی سہی جی تو لیتی تھی۔۔۔ زندگی کو میں نے آنکھ کھولتے ہی بیسوا کی طرح چھلکے پر دیکھا اس کے باوجود اُس کے تنگے سینے سے چمٹ کر زندہ رہی اس لیے کہ شانوجہ نے مجھے مرنے ہی نہ دیا۔ آج جب شانوجہ موت اور زندگی کے درمیان سے ہٹ گیا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ آرام نہ کروں۔۔۔ تنہا کر چور ہو گئی ہوں۔۔۔ زخمی بیربن سے کب تک راستہ ناپتی رہے گی جرب کہ منزل کا کوئی نشان بھی نہیں گیا اب سوچنے کے لیے بھی تو کچھ نہیں رہ گیا۔"

ڈیر بالڈ نے اپنا گلاس خالی کر کے کافی مقدار میں بھسکی انڈیل لی اور بقیہ گلاس کو شلیا نے سوڈے سے بھر دیا۔

ڈیر بالڈ نے بڑے بڑے گھونٹ لیے اور نصرت گلاس سے زیادہ خالی کر کے اُس نے سگریٹ جلیا۔

کو شلیا خاموشی تھی۔ ڈیر بالڈ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اتنا سنجیدہ کہ کو شلیا نے اس کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا اور سر اُپر اُٹھا کر چھت کی بلندیوں کی جانب دھواں پھینک دیتا۔۔۔ کو شلیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر وہ اکثر سگریٹ کا دھواں اس

کے چہرے پر چھونک کر اُس سے کہا کرتا ہے کہ چاند کے ابر میں چھپنے کا سماں اس سے مختلف نہیں ہوتا۔

نہ بھی اپنا خاص جملہ دہرائی ہے۔ "تم نے چالو سی شروع کر دی ہے۔ اب مجھے ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔"

جب بھی کو شلیا زیادہ پی لیتی تو جانے اُس کی آنکھوں میں اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے آجاتے کہ وہ ہنسنی تب بھی اُس کی آنکھیں نم رہتیں۔ ڈیر بالڈ جان جاتا کہ کو شلیا کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا سمندر بہنے کے لیے کسی نئے غم کا سہارا چاہتا ہے۔ ایسے کسی غم کا جو وہ سوہنہ ہوتی تو غم ہی نہ بن سکتا تھا۔

لیکن آج کو شلیا کے لیے ڈیر بالڈ کو سمجھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اتنا مشکل کہ وہ اپنے آنسوؤں کو بھول گئی تھی۔

"تم آج پہچانے نہیں جاتے ہو"۔ بیری کی نئی بوتل کو نگ میں احتیاط سے خانی کرتے ہوئے اُس نے ڈیر بالڈ سے کہا۔

اُس نے جیسے کو شلیا کی بات سُنی ہی نہیں۔

"تم کہاں کھو گئے ہو؟"۔ کو شلیا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

کچھ کہنے بغیر ڈیر بالڈ نے کو شلیا کو لمحہ بھر کے لیے دیکھا۔ پھر گلاس اٹھا کر اُس نے مونٹوں سے لگایا اندر خالی گلاس میں زبرد کھ کر سگریٹ کے کش

لینے لگا۔

”تمہیں آج کیا ہو گیا ہے ڈیر؟“ — کوشلیا نے گُرسی پر اپنی نشست سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیا ہو سکتا ہے“ — ڈیر بالڈ نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔
— میں تو صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ زخمی پیروں سے جب تم راستہ ناپتی رہی ہو، کوئی تمہارے ساتھ بھی اگر کبھی رہا ہے تو تم نے اس کو بالکل بھلا دیا ہے۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو ڈیر — کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کس نے کس کو بھلا دیا اور کس نے بھلا دینے کی کوشش میں زندگی گزار دی — کوشلیا خاموش ہو گئی — ڈیر بالڈ نے پھر چُپ سا دھلی تھنی — کوشلیا کہنے لگی —
”ہم ایسے مسافر ہیں کہ بس چلتے ہوئے بھلے لگتے ہیں۔ رُکتے ہیں تو سانس اُکھڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے — سو اُٹھو ڈیر بھول جاؤ ان باتوں کو — آج پہلی بار تم گڑبڑ ہو اور میں منار ہی ہوں۔ محبت کا نہ پیمانہ ہے نہ ترانہ — یہ تو ایک کھیل ہے زندگی اور موت کے درمیان۔ نہ میں حساب کتاب کروں نہ تم ناپو — اس کھیل میں بار اور جیت تک کے فیصلے نہیں ہو سکتے۔“

ڈیر بالڈ نے نظریں اٹھائیں — کوشلیا نے دیکھا اس کی آنکھوں کا سمندر ڈیر بالڈ کی آنکھوں میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ "میں ابھی دھسکی لے آتا ہوں۔ بٹھاری میرے وقت میں اپنی دھسکی بھول گیا تھا۔"

"تمہیں فیوزے جانے آنے میں کافی دیر ہوگی۔ جلد میں بھی چلتی ہوں۔ یہاں اکیلی کیا کروں گی؟

"انہیں میں فیوزے نہیں جاؤں گا۔ میں نے پیارے لال سے کہہ

قا۔ وہ لے آیا ہوگا۔ بس یہیں شانو کے کمرے تک جانا ہے۔"

ڈیر بالڈ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کوشیا

وہ کبھتی رہی۔ وہ چلا گیا تو کوشیا کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ جب وہ

لے میں داخل ہوئی تھی تو اس کا بدن تھکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن

وقت جب کہ وہ کرسی پر نیم دراز تھی خود کو بہت تازہ محسوس کر رہی تھی۔

بیرگانشہ اس کے انگ انگ میں سرایت کر گیا تھا۔ تیز پینے کے

بے اس نے تیسری بوتل بھی نصف سے زیادہ چڑھا لی تھی۔ کوئی

آنکھیں موند کر لڑیاں دینے کے درپے تھا اور وہ نیند کی آغوش میں

اتج دینے کے لیے تیار تھی۔

اس نے پل بھر کے لیے سوچا۔ اب اس سے زیادہ جاگا نہیں

ہوگا۔ ڈیر بالڈ آئے تو وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر سو جائے گی۔ یہی

سوچتے اس نے دو ایک بار شانوہ کو کبھی ساری میں کبھی نراک در

شوار میں کبھی فوجی وردی میں دیکھا اور پھر انکھ گئی۔

درمیان میں ایک آدھ بار اُس کی آنکھ کھلی تو نیند کے غلبے نے کچھ سوچنے
 نہ دیا اور وہ آخر میں گہری نیند سو گئی۔

جب وہ آنکھیں مل کر پوری طرح بیدار ہو رہی تھی تو اُس نے محسوس کیا
 تھا کہ وہ اپنی کٹیا میں نہیں ہے۔ اور اُس نے بجلی کی سرعت سے اُرسی
 پر اپنی نشست درست کر لی تھی اور ایک بھر پور جمباہی کے دوران میں اُس
 کا بیدار ذہن اُس کی نیم خوابیدہ آنکھوں کو ساری کہانی یاد دلایا چکا تھا کہ کس
 طرح، کب اور کیوں رونزلے میں آئی ہے۔

ڈیر — ڈیر — اُس نے پکارا۔
 پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھی — مجھڑانی کو ایک کونے سے سرکا کر اُس نے
 پلنگ پر دیکھا لیکن بستر پر ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔

نہ تڑپ کر پٹی، کسی نے حقائق کا جیسے اُس پر انکشاف کر دیا۔ کسی نے
 اس کے کانوں پر ہرٹ رکھ کر جیسے سرگوشی کی، شانوجہ نے تم سے یہ رہا سہا
 سہارا بھی چھین لیا ہے — تم شانوجہ کی ماں ہو — یا اُس کی —
 یا اُس کی سو کن؟

نہیں — نہیں — نہیں۔

اور کوشلیا پاگلوں کی طرح کمرے کے نمبر پڑھتی ہوئی شانوجہ کے کمرے

ٹیک سے یاد کیا اندر بند دروازے پر آکر اُس نے بے تحاشہ دروازہ
ڈال۔

شانوہ انکڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ ”کون ہے — کون ہے؟“
ضجھلا کر اُس نے در سے پوچھا۔

لیکن کوئی پاگل کی طرح دروازہ مسلسل پیٹ رہا تھا۔
شانوہ نے اپنے ننگے جسم کے اطراف مثال پیٹنے کے لیے پٹنگ سے
لگائی۔ پھولوں کی پنکھڑیاں جو اس کی پشت اندر چوتروں سے چمٹ
اُفرش پر آگئیں۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز مثال پیٹ کر دروازے
بچا اور چٹخنی کھول دی تو دروازے کے دونوں پٹ بیسرا کے محرم کی طرح

نلیا نے پوچھا — ”کہاں ہے وہ؟“

نوجہ مسکرایا — اُس نے کو شلیا کی پروا کیسے بغیر کہا — میرے بدن
میں ہیں — میں شان کے اندر بالکل ننگا ہوں — خلاف معمول تم
سے کپڑے پہنے ہوئے ہو جیسے رات تم نے کپڑے اتارے ہی نہیں
جی کوئی مصداقہ نہیں — لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ تم اب
یہ کہنے کے لیے نہیں آئی ہو کہ میں تمہیں ماں پکار سکتا ہوں۔“
نلیا نے شانوہ کے لگائے ہوئے زہریلے نشتر کو تڑپ کر محسوس کیا۔

”بکواس بند کرو — پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ہے کہاں؟“
 ”وہ جا چکا ہے اور اگر موتا بھی تو تم اُس کا کیا بگاڑ لیتیں؟“
 ”تو تم اُس کا پہلو بھی گرما چکے ہو؟ — تم جانتے ہو — تم
 جانتے ہو کہ نہ میرا —“

شانو جہ چونکا — اُس کی سمجھ میں آیا کہ کوشیا پیارے لال کو نہیں
 اپنے ڈیر بالڈ کو پوچھ رہی ہے۔
 شانو جہ نے حقارت سے کوشیا کو دیکھ کر کہا — ”اذا نہ اس کی گرہ میں
 اتنے دام نہیں ہیں کہ وہ مجھے اپنے پہلو میں لے سکے۔“
 ”ورنہ تم اس کے بھی ہو جاتے؟“

”نہیں جی — اس کے تو میں پتا جی کہہ کر بیڑ پکڑ لیتا۔ تم یہی
 چاہتی تھیں نا۔“

”مجھ پر طنز کرتے ہوئے انوس ہے کہ تمہارا دل روتا نہیں ہے۔“
 ”رو لے گا۔ آہستہ آہستہ رو لے گا۔ پہلے تم مجھے ان سارے مردوں
 کا حلیہ بتاؤ جو تمہارے ہو چکے ہیں، تاکہ جب وہ میری طرف ہاتھ بڑھائیں
 تو میں ان کی کلائی مرڈ کر پوچھوں کہ تم میرے باپ تو نہیں ہو۔ یا پھر ان
 کا گریبان پکڑ کر تمہارے سامنے لے آؤں — تم سے کہوں کہ ماں پہچانے
 یہ میرا باپ تو نہیں ہے — اور جب تم نفی میں سر ہلاؤ تو اپنا جیم اُس کی آغوش

نیں دے دوز اور جو تم پہچان سکو کہ وہ کبھی تمھارے ساتھ بھی سوچکا ہے
تو میں اُس کی ادا کی ہوئی ساری رقم لوٹا کر اُس کے پیر بچوں کو پتا جی مجھے مٹا
کر دو۔“

کوشلیا بھوت کھڑی شانو جہ کی لن باتیں سنستی رہی — پھر اُس نے
ہاتھ کا تلوں پر رکھ ایسے اور چیخ بڑی — ”شانو — شانو — بس کر دو
شانو۔“

کوشلیا کی چیخ کا یہ تیر شانو کے دل پر تازہ بن گیا — کوشلیا کو گھائل
کرتے کرتے اُس کی بے بسی پر خود شانو گھائل ہو گیا۔

وہ منٹ بھر خاموش رہا — پھر بڑھ کر اُس نے کوشلیا کو سہارا دیا
جو دروازے کا پٹ تھا مے سسک رہی تھی۔

سہارا پا کر کوشلیا کمرے میں چلی آئی پھر اُس نے شانو کو نظر بھر کر دیکھا۔
پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کر سکنے لگی۔

ہاتھ بڑھا کر شانو نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اُس کو چٹختنی بہت مشکل سے
نظر آئی کیونکہ اُس کی آنکھوں میں تیر گئے۔

اُس نے کوشلیا کو بھینچ لیا — ”ماں — تو کیسے انکار کر دے گی
ماں کہ تو میری ماں نہیں ہے — میں تجھے جانتا ہوں ماں۔ تو نے سایلوں کے
پچھے زندگی بتا دی ہے — میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس جہنم سے تو بھاگتی

رہی ہے میں اُسی جہنم میں جھٹے کھینچ لایا ہوں۔ میں بھی کوئی خوش نہیں ہوں
 لیکن مجھے کوئی افسوس کبھی نہیں ہے۔ سنا آج بھی مطمئن ہوں کہ میں بہتوں
 سے اچھا ہوں۔ وہ لوگ جو مجھ پر بے دریغ لٹاتے ہیں وہ مجھ سے بڑے مجرم ہیں
 ماں۔ اُن کی گرہ میں جو زام میرے لیے ہوتے ہیں وہ رشتو توں اور نا جانز
 ٹھیکوں سے کمائی ہوئی دولت کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن زمانہ اُن کے
 آگے جھکتا ہے۔ ان کی بڑی بڑی میڈرین آنکھوں کو خیرہ کر کے اس طرح گزر
 جاتی ہیں کہ آدمی کو آدمی کا خون نظر نہیں آتا۔ ہمارا جرم تو اتنا ہے کہ
 ہم اپنے ہی خون میں زہر ملا کر منگن ہو بیٹھے ہیں۔ کل جب ایک اچھے سے بنگلے
 سے اچھی سی کاریں بیٹھ کر تو اندر میں نکلیں گے تو کتنی ہی نظریں تعظیم کو جھٹک
 جائیں گی۔ خدا کی خدائی سے انکار کرنے والے بہت سے دیکھے ہیں، دولت کی
 خدائی سے انکار کرنے والا تو نے آج تک نہ دیکھا ہے ماں؟“

کو شیا نے سب کچھ سُسنے کے بعد بھی شانو کے سینے سے گردن اٹھائی تو
 اُس نے یہی سوال کیا۔

”سچ بتا دے شانو کیا وہ یہاں آیا تھا؟“

”نہیں ماں، وہ میرے پاس چاہے بھی تو آ ہی نہیں سکتا۔ میں اُس کی
 پہنچ سے باہر ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں۔“
 ”پیارے لال کہاں ہے؟“

”وہ رات ڈھلتے جا چکا ہے۔ اُسے صبح ہونے تک برہنہ ہستی سے ہو کر
شہر پہنچنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈیر بالڈ بھی اُسی کے ساتھ گیا ہو۔۔۔ لیکن تو
اس قدر دل گیر کیوں ہوتی ہے۔۔۔ جانے دے رہتا ہے تو مجھے کون
سا نہال کر دیتا ہے۔ اُلٹے تو ہی اس پر خرچ کرتی ہے۔“

کو شلیا خاموش ہو رہی۔۔۔ نہیں رے۔۔۔ پھر نہ آگے کچھ اور نہ
کہہ سکی۔ اس نے اپنی دونوں آنکھوں کو دونوں ہاتھوں کی پشت سے مل کر
خشک کیا اور مسکرا کر کچھ اس طرح شافو جہ کو دیکھا جیسے دل ہی دل میں اُس
کی ذہانت کا اعتراف کر رہی ہو۔

پھر اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے کہہ دیا۔۔۔ ”تو ایک دم گستا
ہو تیار ہو گیا ہے شافو جہ۔“

شافو ہنس۔۔۔ ”ایک دم ہو تیار ہو گیا ہوں؟“ اُس نے بڑا یہ
طور پر دہرایا۔ اور جب پلٹ کر پلنگ کی طرف بڑھنا چاہا تو شال کا ایک جھٹہ
جسے وہ اڑھے ہوئے تھا اُس کے ہاتھ سے جھٹک کر اُس کے پیچھے اس
طرح جھبیل گیا کہ کو شلیا نے اُس کی پشت پر اور اُس کے چوتروں پر پہلے
گلاب کی پنکھڑیاں چمٹی ہوئی دیکھیں

یہ گلاب پیارے لال کے لیے شاید شافو نے اس وقت توڑے تھے جب
وہ نجد سے ملنے کے لیے جھیل پر آیا تھا۔

کو شلیا نے بڑھ کر شال اُس کی پشت پر اس طرح رابر کر دی جیسے اپنا
ہی بدن چھپا رہی ہو۔

"تو اب میرے ساتھ چلے گا نا؟" — کو شلیا نے لاد سے پوچھا۔
"تو تیرے گھر میں میرے لیے بگہ نکل آئی ہے؟" — میں جانتا تھا۔
"تو مجھے اپنے گھر سے نکال دے بھی تو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی۔"
"کل پیارے لال سے ڈیر بالڈ نے اپنے لیے دھسکی منگو اسی تھی۔"
"تو جانتا ہے کچھ؟"

"نہیں ماں۔ منگو اتا تو ن ضرور لینے آتا اور جو لے نہ جاتا تو یقیناً بلو
میرے پاس چھوڑ جاتا کہ میں اسے دسے دوں۔ بلو آدمی بڑا نہیں ہے
ماں، کم سے کم اتنا تو ہے کہ جھوٹی سچی محبت جتنا کہ مفت میں میرے جسم تک
پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔"
"کون بلو؟"

"بلونت، یعنی تمھارا پیارے لال، اسے میں پیار سے بلو پکارتا ہوں۔"
"تو اسے چاہتا ہے اتنا؟"

"یاں ماں دام کھرے ہو جاتے ہیں تو میں رات کی رات ہر اُس مرد کو
اتنا ہی چاہتا ہوں جس کے ساتھ رات گزارنی ہوتی ہے۔"
"پر سنا ہے کہ پیارے لال حیرے پاس زیادہ ہی آتا ہے۔"

پہلے بھی تو اُس سے چھپ چھپ کرتا رہا ہے۔
 ”اس لیے کہ پیارے لال مجھے پسند کرتا ہے۔ تو کہہ سکتی ہے کہ چاہتا ہے۔
 بالکل اُسی طرح جیسے تو ڈیر بالڈ کو چاہتی ہے۔“
 کوشیا خاموش ہو رہی۔

دیکھ تو پو پھٹ رہی ہے۔ اچھا تو ذرا میرے بستر پر لیٹ رہی ہیں
 ہناؤ کر تیار ہو لیں۔

شانوہ غسل خانے میں چھپا کے سے داخل ہو گیا تو کوشیا نے بستر پر
 بکھری ہوئی پیلے گلاب کی پنکھڑیاں دیکھیں۔ پھر بستر کی شکنوں اور سلوٹوں
 پتہ نہیں کیا کیا کہانیاں اُسے سنائیں۔ وہ چپکے سے شانوہ کے بستر کے قریب
 سے ہٹ آئی اور کرسی پر پرس کر بیٹھ گئی لیکن وہ پھر کچھ اذاس ہو گئی تھی۔
 شانوہ ہناؤ دھو کر مردانے کپڑے پہن کر آیا تو وہ بھی اُس پر سوج رہے تھے
 اُس نے کہا۔ ”ماں ذرا فیوزے کو فون کر لوں۔ آج برزد لے کھچا کچ بھرا ہوا ہے
 کوئی نہ کوئی ٹیکسی ہوگی ہی۔“

”کتنی دُور ہے۔ اب تو ٹیکسی سے کم چلے گا نہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے ماں۔ دیکھنا ساتھ کتنا سا مان ہے۔“ اور شانوہ
 نے جھک کر پلنگ کے نیچے سے دو بڑے کیس گھسیٹ نکالے۔ پھر بی کی ایک باکیٹ
 نکالی جو مقفل تھی۔ ”اس میں ابھی اچھی سٹرا ہیں۔ اُس نے سیر کی

باسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "اور میں تیرے لیے بہت کچھ لایا ہوں ماں۔ رسٹ ڈاچ ساریاں تو فدا ہنس دے۔ ہنس دے نا۔"

بہتے تو میرے پیسے ایک ایک پل روتی ہے۔
 کوشیا ہنسے لگی تو اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اُس نے پوچھا — "تجھے کس نے بتایا شانو؟"

"میں نے تو خود تجھے خوابوں میں روتے ہوئے دیکھا ہے ماں —" اندر اُس نے کوشیا کی گردن میں باہیں ڈال دیں اندر اُس کے گال چوم پیسے اور فون کرنے کے لیے تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔

لوٹ کر اُس نے بتایا کہ ٹیکسی آرہی ہے۔

"میں بھی اپنا سامان لے آتا ہوں — کوشیا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی تو

شانو نے پکار کر پوچھا — "کیا کوئی دزنی سامان ہے ماں؟"

"نہیں شانو اس نے جواب دیا اور دل ہی حول میں خوش ہوئی کہ شانو

اُس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

کمرے میں ادھر ادھر بڑی بڑی چیزیں کو اُس نے ڈیر بالڈ کے سوٹ کیس میں رکھا جو وہ چھوڑ گیا تھا اور دروازہ بھیڑے بغیر کمرہ خالی کر کے چل پڑی۔

شانو نے دونوں کمروں کا بل لاد کیا — تو کوشیا کو ڈیر بالڈ کی یہ بات

اچھی نہ لگی کہ اُس نے بروئے کابل ادا کرنے کی نہ حمت کی — اندر نہ جانے سے پہلے اُسے بتایا ہی۔ اور دن وہ ایسا کرتا تو شاید کو شلیا اتنا زیادہ محسوس نہ کرتی۔ وہ ڈیر بالڈ کو شانو کے سامنے کسی طرح بھی سرسندہ ہوتا نہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شانو اپنے پیارے لال کی تعریفیں اس طرح نہ کرے کہ کو شلیا کو ڈیر بالڈ سے تقابل کا احساس ہو اور شانو ہمیشہ کچھ اسی ڈھب سے باتیں کرتا تھا کہ ڈیر بالڈ جیسے اُس کے لیے ناپسندیدہ اجنبی ہے۔ وہ تو کو شلیا کے پاس اتفاقاً پیسے بالکل نہ تھے — اُس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی اور جو ہوتے تو یقیناً وہ جھٹ سے فیوزے کابل چیکاکی ہوئی کہتی کہ ڈیر بالڈ اپنا پرس یہیں چھوڑ گیا ہے مگر مجھے کوئی تکلیف نہ ہو — لیکن اب سوائے شانو جہ کو دیکھتے رہنے کے اُس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

ٹیکسی میں شانو کے پاس بیٹھتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ ڈیر بالڈ اپنی رقم اُسی کے صندوق میں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن چابیاں کہاں ہیں؟ — اسی نے جلدی سے اپنی ساری کاپلو دیکھا جو بغیر کسی سلوٹ کے بالکل سترہا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اڑھادھرا اپنے نیپے میں ٹوٹا۔ پھر اُس نے ٹیکسی رکوائی جو اسٹارٹ ہو چکی تھی اور پیٹ سے دروازہ کھول کر اتر پڑی۔

”کیا بات ہے ماں؟“

”چابیاں بھول آئی ہوں — لیکن ٹیکسی سے اتر کر وہ دو قدم چلی ہی

تھی کہ اُس کو یاد آگیا کہ چایاں ڈیر بالڈ نے اپنے کوٹ کی جیب ہی میں رکھ لی تھیں۔

وہ بناوٹی ہنسی ہنس کر لوٹ آئی اور ٹیکسی میں پھر سوار ہوتے ہوئے کہا کہ اُسے یاد آگیا ہے اُس نے چایاں سوٹ کیس میں رکھ لی ہیں اور بظاہر اطمینان سے شانڈ کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شانڈ کو بتلائے کہ ڈیر بالڈ نے اتنی بڑی رقم اُس کے پاس رکھی ہے۔

ٹیکسی روانہ ہوئی تو کھائی کے قریب پہنچ کر اُس نے ڈیر بالڈ کو اُس مقام پر یاد کیا جہاں کھائی میں بھول چھینکنے سے قبل ڈیر بالڈ نے اُس کے ہونٹوں کو چومنا اور اپنی محبت کی ہمیشہ کی طرح تسمیں کھائی تھیں۔

”ماں کا کا بھی مجھ سے خفا ہوگا۔ کیوں ہے نا؟“ شانڈ یہ یکا یک پوچھ بیٹھا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

”کا کا کی خفگی کتنی شانڈ۔ ہم ہنستے ہیں تو وہ غصہ بھول جاتا ہے۔ مجھے روتا ہوا نہ دیکھتا تھا تو تجھ پر کڑھتا تھا۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھے گا تو تجھ یوں سینے سے لگا لے گا جیسے تو نے کوئی کارنامہ کیا ہے۔“

”میں نے بہت بڑا کارنامہ تو کیا ہے ماں۔“

”یہی نا کہ مجھے سوسائڈر لایا ہے۔“

”نہیں ماں جس آدمی کو میں نے رجھا کر اپنا لیا ہے۔ اُس کے پاس بے شمار

دولت ہے اندر نہ میرا عاشق ہے۔ دیکھ لینا ہم اُس سے کتنا کمالیں گے۔ مجھے
 بقین ہے ماں کہ نہ نہ چار دن ہی میں سوڑ بھیج کر مجھے بلائے گا۔ عجب نہیں
 یہ خود چلا آئے۔ کہتا تھا کہ جھیل کے کنارے تمہارے پُر نضا جھونپڑے کی تریف
 سنی ہے کبھی آ کر دیکھوں گا۔ تاکہ اس جھونپڑے کی ایک چھوٹے سے نہایت
 خوبصورت بنگلے میں بدل سکوں۔ ایسے بنگلے میں جس میں میرا حسین شانوارام
 سے رہ سکے اور یہ کہتے کہتے اُس نے مجھے کھینچ کر اپنی گود میں بھر لیا تھا۔
 اندر پھر —

"ہشت — تو کتنا بے شرم ہو گیا ہے رے۔"
 کو شیا نے اُس کو ٹوک دیا — لیکن شاذ بہ بالکل بے پرواہی ہنس پڑا۔
 وہ سوڑ کے باہر پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کو کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے
 جھیل کے کنارے صرف اپنا حسین، جمیل، چھوٹا سا بنگلہ دیکھ رہا ہو جو دوڑتے
 ہوئے سوڑ کے باہر بار بار اُس کی نظروں سے ہو کر پیچھے بھاگ رہا ہو۔
 اُس نے باہر ہی محویت کے عالم میں دیکھتے ہوئے پھر اپنا شروع کیا۔
 "ماں جب خان آئے گا تو میں اُس سے کہوں گا کہ میں نے قسم کھا رکھی
 ہے کہ برنڈے، فیروزے اور جھیل کی اس سرزمین پر میں خان کی آغوش میں
 اُسی وقت آؤں گا جب کہ جھیل کے کنارے میرا بنگلہ تعمیر ہو جاتے۔ اسی بنگلے
 میں خان مجھے اپنا سکے گا اُس وقت تک وہ مجھے یہاں ماتھے نہیں لگا سکے گا۔"

ویسے مجھے یہاں سے دُور کہیں بھی لے جاسکتا ہے — تو دیکھنا ماں — وہ
 کچھ سوچ کر پھر کہنے لگا ”خان کو مجھ سے ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہ ہوگی۔
 — جب یہاں تک آکر بھی نہ مجھے اپنانے سے محروم رہے گا تو میری ضد پوری
 کرنے کے لیے قوری تعمیر شروع کر دے گا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر نہ ایک
 دن کے لیے چلا جائے گا — میں نے اُس پر جادو کر دیا ہے ماں — جادو
 کہ شیانے شانو کو دیکھا تو اُس کو محسوس ہوا کہ شانو بھی اُسی کی طرح
 کسی خیالی دنیا میں رہتا ہے — فرق صرف اتنا ہے کہ شانو کی دنیا
 خوبصورت شگلوں اور مڑوں سے بنی ہے اور اس کے اپنے کچے گھر و ندوں
 اور چاندنی راتوں سے۔

ٹیکسی جھیل کے باغ کے چھوٹے سے گیٹ پر رکی تو ہارن بجانے پر بھی
 کا کا نہیں آیا — وہ یقیناً اتنی صبح صبح بھی کسی کو بھرے میں جھیل کی سیر
 کر رہا ہو گا۔

”ماں — میں کا کا کو اب کچھ کرنے نہ دے گا — اسے آرام سے رکھوں
 گا ماں۔“

کو شیانے پلکیں جھپکا کر ایسی آنکھوں سے شانو کو دیکھا جیسے اُس کو
 پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

جب وہ جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے تو سامان اٹھا کر رے چلنے والوں میں

ن کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا۔ کرایہ اور انعام دے کر شانہ نے سامان سرور کھا اوردھھیل کی طرف کا کاکڑ دیکھنے کے لیے چل نیا تو کہ شلیا بھی تیز نہ قدم اٹھاتی اپنے سر نے کے کمرے میں پہنچی جہاں اُس نے ڈیر بالڈ کی رقم لے رکھی۔

صندوق کا قفل کھلا ہوا تھا۔ اُس نے کنڈی سے قفل الگ کر کے سٹ سے صندوق کھولا تو اس کو ادھر ہی رکھا ہوا ایک خط نظر آیا۔ اُس نے جیننی سے خط نکال لیا اور پڑھنے لگی۔ دشمن ہوش میری محبوبہ دلنواز کو ش

میں تمہارا ہوں۔ تمہارا رہوں گا۔ تم نے آج کمرے پر اپنے دُکھ درد کا ذکر لیکن مجھے اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے میں تمہارا غموں کا ساتھی نہیں ہوں۔ ستہ اناس ہو گیا تھا اور تم سے جو کہنا چاہتا تھا وہ کہہ دینا مجھے اس وقت مناسب معلوم نہ ہوا۔ میری بیٹی کی شادی ہے اور مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے جس قدر قرض مل سکتا ہے حاصل کر دوں تاکہ میری پریشانی تمہاری ہمدردی اور محبت کے ہاتھوں سکون میں بدل سکے۔ تم جی ہو کہ اس کاروباری دنیا میں لڑکے والے لڑکی سے نہیں، اُس کے پیسے بہت زیادہ بچاتے ہیں۔ تم میرے اس درد کو جس طرح جان سکتی ہو شاید دنیا نہ نہ سکے اس لیے کہ تم پر بیٹی ہے۔ تمہاری ماں نے تمہارے بے پناہ حسن

کے بانی جو مختار سے ہاتھ اس لیے پیلے نہیں کئے کہ نہ آسمان سے ہُن برسے کہ
 انتظام میں تھی اندر تم اس ہُن کا انتظام کیے بغیر شان و جہ کے باپ کے ساتھ بہت
 دُور نکل گئیں۔۔۔ اتنی دُور کہ پھر لوٹ نہ سکیں۔۔۔ کوش میں اپنی رقم کے علاوہ
 مختار سے صندوق میں جو کچھ رقم لی سکی لے جا رہا ہوں۔ صرف آٹھ سو اکیاسی
 روپے ملے ہیں۔ میں تمہیں ایک ایک پائی لوٹا دوں گا کوش۔۔۔ جان دیکھنا
 مجبوری کیسی بڑی بلا ہے۔۔۔ وہ بھی کسی نادر باپ کی مجبوری میں بچا ہے اس
 کے کہ مختار سے ناز اٹھاتا، مختار سے احسان اٹھا رہا ہوں۔

تمہیں شادی کی تاریخ لکھ دی گا۔۔۔ آؤ گی؟۔۔۔ میں جانتا ہوں
 مختار ازل اتنا بڑا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔۔۔ اور یہ سوچ سوچ کر میں
 خوش ہوں کہ چلی میرے کام آئیں تو تم آئیں۔ تم جو میری زندگی کی پونجی ہو۔
 ۔۔۔ زور جانے میں کس گس کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔

مختار ہمیشہ مختارا

سعید الزماں ڈیرہ بالٹ

جب کوشلیا نے کا کا اور شان و جہ کو جھیل کی طرف سے لوٹتے ہوئے دیکھا تو
 وہ ڈیرہ بالٹ کے اسی خط کے بارے میں سوچ رہی تھی جسے ابھی ابھی پڑھ کر وہ اپنے
 صندوق میں چھپا آئی تھی۔ کوشلیا کو مسکراتا ہوا سوچ کھ کر کا کا نے کہا۔۔۔
 ”آج بیٹا گھر آیا ہے تو تیرے ہونٹ ہی نہیں نہ آنکھیں بھی مسکرا رہی جو بات

اُن کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا۔ کرایہ اور انعام دے کر شانہ نے سامان اندر رکھا اور جھیل کی طرف کا کا کو دیکھنے کے لیے چل نیا تو کو شلیا بھی تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے سرنے کے کمرے میں پہنچی جہاں اُس نے ڈسٹر بالڈ کی رقم رکھی تھی۔

صندوق کا قفل کھلا ہوا تھا۔ اُس نے کنٹری سے نفل الگ کر کے جھوٹ سے صندوق کھولا تو اس کو ادھر ہی رکھا ہوا ایک خط نظر آیا۔ اُس نے بے چینی سے خط نکال لیا اور پڑھنے لگی۔ دشمن ہوش میری محبوبہ دلنواز کو ش

میں تمھارا ہوں۔ تمھارا رہوں گا۔ تم نے آج کمرے پر اپنے دُکھ درد کا ذکر کیا لیکن مجھے اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے میں تمھارا غموں کا ساتھی نہیں ہوں بہت اناس ہو گیا تھا اور تم سے جو کہنا چاہتا تھا وہ کہہ دینا مجھے اس وقت کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ میری بچی کی شادی ہے اور مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے جس قدر قرض مل سکتا ہے حاصل کر دوں تاکہ میری پریشانی تمھاری ہمدردی اور محبت کے ہاتھوں سکون میں بدل سکے۔ تم جانتی ہو کہ اس کاروبار میں دنیا میں لڑکے دانے لڑکی سے نہیں، اُس کے پیسے سے بیاہ رہتے ہیں۔ تم میرے اس درد کو جس طرح جان سکتی ہو شاید دنیا نہ سمجھ سکے اس لیے کہ تم پر بیٹی ہے۔ تمھاری ماں نے تمھارے بے پناہ حسن

شانو نے کوشلیا کی حیرانی دیکھی تو اُس کی کمر میں گدگد کر کہا — ”ماں تو ڈیر بالڈ کی ساری ہی باتوں کو سچ مانتی ہے — اور جو کچھ میں کہتا ہوں تو اُس پر یقین کر لیتی ہے — خود سے اس نتیجہ پر پہنچتی ہی نہیں کہ ہم دونوں میں کون جھوٹا ہو گا — ہو سکتا ہے کوئی اُس کی بیٹی ہو — میں نے تو یونہی مذاقاً کہہ دیا تھا ماں! — اور شانو بھر نے سینٹر ابدل کر سوچا کہ ڈیر بالڈ کے اس جھوٹ کے پیچھے جانے کتنی باتیں چھپی ہیں جو آہستہ آہستہ ماں اُسے تب ہی بتائے گی جب کہ یہ جھوٹ چھپا رہے۔

لیکن کوشلیا ساری باتوں سے بے نیازی، دُور دُور جھیل کی سمت کچھ ڈھونڈ رہی تھی — اُسے کون سمجھا جاسکتا تھا کہ کوئی سچائی اُن آنکھوں کو نہیں ملتی جو اتنی دُور دُور تک دیکھتی ہوں۔

شام ہدیٰ تو برودے کی کھائی پر آدمیوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ جمع تھا۔ جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی کپڑے کی دھجیوں کو دیکھ کر کا کا کا کا شہہ یقین سے بدل گیا تھا کہ وہ کوشلیا ہی تھی جس کے سائے کو کھائی کے منہ پر ڈالتے ہوئے اُس نے دیکھا تھا — کا کا میں نہ وقم چلنے کا یا را نہ تھا اور لوگ اُسے ہارا دیے ہوئے تھے۔

فیوزے کا بیر اصمصام دین درخت کی ازٹ میں چھپا سکیاں بھر کر اُس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رہا تھا جس کا نیا نویرلا کھلیا ناؤٹ گیا ہو۔

ایسا کھلو۔ ناجسے ابھی اُس نے بس چھو اٹھا۔

شان و جہاں اسی کھائی کی طرح غاموش تھا جس میں ابھی کچھ زیرِ پیرے بڑی
بلبل سی مچھی تھی۔

ہینسن کہہ رہا تھا۔ کہ شاید ایک بڑی عورت تھی۔ ایک عظیم ماں جسے نہ
محبت کا سیکھ ملنا نہ مامتا کا۔

پاس ہی کسی ناخستہ کی آواز آ رہی تھی اور سائے گہرے ہو رہے تھے اور
دن ڈوب رہا تھا اور انسانوں کے اس غمِ دل میں کتنے دل ڈوب رہے تھے یہ
نہیں کہا جاسکتا۔

چند عمدہ افسانوی مجموعے

عابد سہیل	۸ روپے	سب سے چھوٹا غم
رام لعل	۷ روپے	کل کی باتیں
سلمیٰ صدیقی	۷ روپے	مٹی کا چراغ
اقبال مجید	۱۷ روپے	دو بھگے ہوئے لوگ
اقبال متین	۱۷ روپے	سُنا ہوا البم
رتن سنگھ	۵ روپے	پہلی آواز
جو گندراپال	۱۷ روپے	رسانی
مظفر حنفی	۵ روپے	دو غنڈے

ظفر و مزاح

یوسف ناظم	۵ روپے	فٹ نوٹ
احمد جمال پاشا	۷ روپے	ستم ایجاد

نصرت پبلشرز کپور مارکیٹ و کٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۲۰